بسم الله الرحمن الرحیم

شعور اتحاد

سال اول ۞ شمارہ (۴) ۞ رجب المرجب، شعبان المعظم، رمضان المبارک ۱۴۲۹ھ ۞ جولائی، اگست، ستمبر ۲۰۰۸ء

پیشکش: مجمع جہانی تقریب مذاہب اسلامی

نگران اعلیٰ: آیۃ اللہ محمد علی تسخیری

مدیر مسؤل: علی اصغر اوحدی

علمی گروہ کی زیر نگرانی

چیف ایڈیٹر : سید احتشام عباس زیدی

سہ ماہی ''شعور اتحاد'' مسلمانوں کے درمیان اتحاد کو مستحکم بنانے نیز عالم اسلام کو فقہی، حقوقی، کلامی، فلسفی، تاریخی و... میدانوں میں درپیش مشکلات اور دشواریوں کے حل کے لئے نئی راہیں کھولتا ہے۔

یہ مجلّہ مذکورہ بالا اغراض و مقاصد کے متعلق لکھے جانے والے علمی مقالوں کا استقبال کرتا ہے۔

یہ مجلّہ مقالات کی ایڈیٹنگ اور تلخیص میں آزاد ہوگا۔

مجلّہ کے مطالب نقل کئے جاسکتے ہیں لیکن حوالہ ضروری ہے۔

....

ایڈریس: تہران، خیابان آیۃ اللہ طالقانی، شمارہ ۳۵۷ ''مجمع جہانی تقریب مذاہب اسلامی''

معاونت فرہنگی و پژوہشی

ٹیلی فون: ۱۳-۸۸۳۲۱۴۱۱-۸۸۸۲۲۵۳۲ ای میل andisheh@taqhrib.org

فہرست

ماہ شعبان و رمضان کلام معصوم میں ۵

فکر و شعور

اسلامی امت میں اہل بیت کا علمی مقام ۱۳
تقریب کی اسٹریٹیجی ۲۹
اسلامی اتحاد کے لئے امام علیؑ کا خلفا سے تعاون ۵۷
فقہی اجتہاد اور اسلامی مذاہب کی تقریب میں اس کا اثر ۹۳

اتحاد کے علمبردار

پرچم دار اتحاد شیخ محمد حسین بن علی کاشف الغطا ۱۴۱
شیخ محمد عبدہ اصلاح کے پرچم دار ۱۵۹

عالم اسلام کا تعارف

اسلام انڈونیشیا میں ۱۸۱

اداریہ

ماہ شعبان ورمضان کلام معصوم میں

اگر چہ پروردگار عالم نے انسانی حیات کومنظّم واستوار کرنے کے لئے ماہ وسال کی گردشوں، ہفتوں اور دنوں کا بہترین نظام قائم کیا ہے اور انھیں انسان کی عمر کے لئے بہترین پیمانہ قرار دیا ہے۔لیکن جس طرح رسولوں میں بعض کوبعض پرفضیلت عطا کرتے ہوئے فرمایا:﴿**تلکَ الرُّسلُ فضلنّا بعضُھم علیٰ بعض**﴾ اسی طرح زمانہ کے حدبندیوں میں مہینوں کے درمیان بعض کوبعض پرفضل وشرف عطا فرمایا ہے۔

اگر چہ اسلامی مہینوں میں بعض حرام اورمحترم مہینے ہیں جن میں جنگ وجدال کوان کے احترام میں حرام قرار دیا گیا ہے لیکن شعبان اور رمضان کے مہینوں کی شان اورعظمت تمام مہینوں میں معنویت اور بندگی واطاعت کے لحاظ سے سب سے بڑھ کر ہے۔

شعبان المعظم

ماہ شعبان اپنے دامن میں بڑی عظمتیں لئے ہوے ہے۔تین شعبان وہ عظیم تاریخ ہے جس میں نبی کے دین کوانحراف اورکج روی، تباہی اور بربادی سے ہمیشہ کے لئےمحفوظ کرکے اپنی قربانی سے اسلام کو بقااور دوام عطا کرنے والی ذات یعنی امام حسینؑ اس دنیامیں تشریف لائے ،اور پندرہ شعبان دین کی دائمی بہار کے نقطہ کمال کی تاریخ ہے جس میں عالم بشریت کے نجات دہندہ خاتم الاوصیاء حضرت امام مہدی (عج)اس دنیامیں تشریف لائے ۔وہ ذات جو پردہ غیب میں ہے اور جس کا انتظار نہ صرف مسلمانوں کو ہے بلکہ تمام ادیان کے ماننے والےحق ظلم وستم کے ہاتھوں کچلی جانے والی پوری انسانیت اس کے منتظر ہیں۔

نیمہ شعبان کی رات اسلامی روایات میں انتہائی اہمیت کی مالک ہے، اور اس شب کو شب قدر کا احتمال بھی دیا گیا ہے چنانچہ اہل علم ومعرفت اس رات کو طاعات وعبادات میں گزارتے ہیں ہم یہاں ماہ شعبان کی اہمیت کو مزید نمایاں کرنے کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چوتھے وصی وجانشیں حضرت امام زین العابدینؑ کی دعاؤں کی مجموعہ میں صحیفہ سجادیہ کی ایک دعا جسے صلوات شعبانیہ کہا جاتا ہے اور اس ماہ میں جسے ہر روز پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے، اس سے شعبان المعظم کے فضائل بیان کرتے ہیں:

''و هذا شهرُ نبيِّک سید رسلک شعبان الذی حففته منک بالرحمة و الرضوان الذی کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و آله و سلم ید اب فی صیامه و قیامه فی لیالیه و ایامه بخوعا لک فی اکرامه و اعظامه الیٰ محلّ حمامه''

''اور یہ مہینہ یعنی شعبان تیرے نبی کا مہینہ ہے جو تیرے تمام رسولوں کے سردار تھے یہ وہ ماہ شعبان ہے جسے تم نے اپنی رحمت اور رضا وخشنودی سے ڈھانپ رکھا ہے وہ مہینہ کہ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز اور روزہ میں اس کے دنیوں اور اس کے راتوں میں بڑی جد وجہد سے کام لیتے تھے اور تیری بارگاہ میں فروتنی کے لئے انھوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک اس مبارک مہینہ کا اکرام اور تعظیم کی''

امام زین العابدینؑ کی دعا کے ان جملوں میں اس باعظمت مہینہ سے متعلق چند خاص باتیں نمایاں نظر آتی ہیں:

ا۔ یہ مہینہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مہینہ ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو مہینہ امت اسلامیہ کہ بانی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مہینہ ہو مسلمانوں میں اس مہینہ کہ کتنی اہمیت ہونی چاہئے، اور جس طرح خود آنحضرتؐ اس مہینہ کو اہمیت دیتے تھے اور اس میں طاعت وعبادات اور نماز وروزوں پر زیادہ انجام دیا کرتے تھے یوں ہی امت اسلامیہ کو بھی اس باعظمت مہینہ

میں عبادت وبندگی اورخودسازی پرزیادہ زوردیناچاہئے۔

۲۔ یہ وہ مہینہ ہے جسے خداوند عالم نے اپنی رحمت اوراپنی رضا وخشنودی سے ڈھانپ رکھا ہے۔ اللہ کی جانب سے رحمت ورضوان کا یہ مہینہ ہمارے اندربھی شوق کی ایک دنیا پیدا کرتا ہے کہ ہم بھی اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح خود کو رحمت و رضاء کردگار کے سایہ میں چھپالیں ظاہر ہے کہ یہ ہماری غفلتوں، کوتاہیوں، برائیوں اور گناہوں سے نجات کا بہترین ذریعہ ہے خداوند عالم نے حدیث قدسی میں خود یہ ارشاد فرمایاہے:

''رحمتی وسِعت علیٰ غضبی''

۳۔ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس مبارک مہینہ میں دنوں میں روزے رکھتے اور راتوں میں نمازیں بجالاتے تھے۔آپ اس مہینہ کے دنوں کا بھی احترام کرتے تھےاور راتوں کا بھی۔اوراس احترام کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ آپ ان اوقات کوعبادات میں بسر کرتے تھےہمیں بھی محترم مہینہ کی دنوں اور راتوں کا احترام، گناہوں سے پرہیزاور عبادات کی انجام دہی کے ذریعہ کرنا چاہئے۔

مکتب اہل بیت میں ماہ شعبان المعظم کو بڑی اہمیت حاصل ہے خاص طور سے یہ مہینہ دعاؤں کا مہینہ ہے امام زین العابدین علیہ السلام نے اپنے ایک شاگرد خاص جناب ابوحمزہ ثمالی کواسی مہینہ میں ایک دعاتعلیم فرمائی جوخاصی طولانی ہےلیکن اس کے عالی معانی،عرفانی مطالب اورخداوند عالم کی بارگاہ میں سوال کرنے کہ اعلاترین نمونوں کودیکھ کرانسان حیرت کے سمندر میں غرق ہوجاتا ہے۔ہم تمام مؤمنین کواس عظیم دعا کی تلاوت اوراس کے گراں قدرمطالب سے فیضیاب ہوناچاہئے۔

رمضان المبارک

یوں تو سارے مہینہ اللہ کے ہیں لیکن افضال الٰہی اورعبادت کے نقطہ نظر سے یہ مہینہ سب سے زیادہ افضل اور باشرف ہے۔ اس مہینہ کو بہارقرآن کا مہینہ قرار دیا گیا ہے اسی مبارک مہینہ میں قرآن کریں جیسی عظیم کتاب اللہ نے اپنے بندوں پراپنی کامل لطف کی صورت میں نازل فرمائی جس میں تمام بنی نوع انسانی کی فلاح اور

نجات کا پیغام ہے یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ارشاد کے مطابق اس مہینہ میں قرآن کی ایک آیت کی تلاوت کا ثواب پورے قرآن کی تلاوت کے ثواب کے برابر ہے۔ساتھ ہی اس ماہ مبارک کی بھری بہار میں یعنی پندرہ رمضان المبارک کو پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوسرے وصی و جانشین بنت رسول حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے نور نظر اور امام علی علیہ السلام کے پہلے فرزند امام حسن مجتبیٰ سلام اللہ علیہ کی پیدائش کا دن بھی ہے جو عملی شکل میں قرآن کریم کا بے مثل نمونہ تھے۔

یہ بات کسی مسلمان سے مخفی نہیں ہے کہ رمضان المبارک اپنی عظمت اور کرامت کے اعتبار سے اللہ کا مہینہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ مہینہ برکتوں اور رحمتوں کا مہینہ ہے، یہ مہینہ توبہ کی قبولیت اور مغفرت کا مہینہ ہے۔آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث ہے کہ اس مہینہ میں شیطان کو قید کر دیا جاتا ہے۔خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ شعبانیہ میں اس کی فضلیت اور عظمت کا ذکر یوں فرمایا ہے:

''ایّھا النـاس ! قد اقبل ا لیکم شھر الله بالبرکة و الرّحمة و المغفرة شھر ھو عند الله افضل الشّھور و ایأامہُ افضل الایّام و لیالیه افضلُ الّیالی و ساعاتہُ افضل الساعات''

(بحارالانوار رج ۹۳ رص ۳۵۶، ح ر ۲۵)

''اے لوگو! بلا شبہہ اللہ کا مہینہ اپنی برکت ،رحمت اور مغفرت کے ساتھ تمھارے استقبال کو آیا ہے۔وہ مہینہ جو اللہ کے نزدیک تمام مہینوں سے افضل ،جس کے دن تمام دنوں سے افضل ،جس کی رتیں تمام راتوں سے بہتر اور جس کی ساعتیں تمام ساعتوں سے افضل و بہتر ہیں''

مذکورہ بالا جملوں میں چند اہم نکتیں ہیں:

۱۔یہ مہینہ تمام مہینوں سے افضل اور اس کے دن رات سب سے زیادہ افضل ہیں۔

۲۔اللہ نے اس مہینہ میں بندوں کو اپنا مہمان بنایا ہے اور ظاہر ہے کہ جب اللہ بندوں کو مہمان بنائے گا تو

بے حساب رزق، نعمتوں اور برکتوں سے نوازے گا۔ اپنا لطف خاص ان کے شامل حال کرے گا، اور ان کی گناہ بخش دے گا۔ چنانچہ وہ خود فرماتا ہے:

" هو شهر دُعيتم فيه الىٰ ضيافة الله و جُعلتم فيه من اهل كرامة الله "

(بحار الانوار، ج ۹۳، ص ۳۵۶، ح ۲۵)

" یہ وہ مہینہ ہے جس میں تمھیں اللہ کی مہمانی کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں تمھیں اللہ کے مکرم بندوں میں قرار دیا گیا ہے "

اور ظاہر ہے کہ خدا کی مہمانی اور اللہ کی جانب سے بندوں کا مکرم کیا جانا اس بات سے ظاہر ہے کہ اللہ اس مہینہ میں قدم قدم پر اور نفس نفس پر اپنے بندوں پر لطف و کرم کی بارش کرتا نظر آتا ہے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اسی خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

" انفاسكم فيه تسبيح و نومكم فيه عبادة و عملكم فيه مقبول و دعاؤكم فيه مستجاب "

(بحار الانوار، ج ۹۳، ص ۳۵۶، ح ۲۵)

" اس مہینہ میں تمھاری سانسیں اللہ کی تسبیح ہیں، تمھاری نیندیں عبادت ہیں، تمھارے اعمال مقبول ہیں اور تمھاری دعائیں مستجاب ہیں "

آدمی ایک ذرا سی توجہ کرے تو اس پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ جاتے ہیں اور وہ اس مہینہ میں خود پر ہونے والے الطاف الٰہی کو محسوس کر کے حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ سانس لینا انسان کے اپنے بس میں نہیں۔ یہ ایک اجباری امر ہے جس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا اور سونا بھی ایک لازمی اور ضروری چیز ہے جسے ترک نہیں کیا جا سکتا اور جو انسان کی سلامت کے لئے سہم ہے ظاہر ہے کہ جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان غیر ارادی اعمال کو بھی اس مہینہ میں عبادت بنا دیا۔ تو اس مہینہ میں کی جانے والی عبادتوں کا کیا حال ہوتا ہے۔

" فأسئلوا الله ربَّكم بنياتٍ صادقة و قلوب طاهرة أن يوفقكُم لصيامه و

تـلاوة کتابه ، فانَّ شقیَ من حُرم غفران اللّٰه فیه هذا الشهر العظیم ''

(بحارالانوار،ج۹۳،ص۳۵۶،ح۲۵)

لہٰذاتم اپنی سچی نیتوں اور پاک دلوں سے خدا کی بارگاہ میں سوال کرو کہ وہ تمھیں اس مہینہ میں روزے رکھنے اوراپنی کتاب کی تلاوت کرنے کی توفیق عطا فرمائے کیونکہ بلاشبہہ وہ شخص شقی ہے جو اس عظیم مہینہ میں خدا کے غفران اوراس کی بخشش سے محروم رہ جائے۔

اگرچہ اس مختصر سے مقالہ میں فضائل رمضان المبارک کسی بھی طرح سمیٹے نہیں جاسکتے اور نہ پورے خطبہ شعبانیہ پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے پھر بھی اس مختصر تحریر میں ان بابرکت مہینوں اوران کی بہترین گھڑیوں سے استفادہ کے شوق کے لئے بہت کچھ موجود ہے۔

فکروشعور

اسلامی امت میں اہل بیت کا علمی مقام

آیۃ اللہ محمد علی تسخیری
ترجمہ: سید احتشام عباس زیدی

مسلمان اپنے درمیان بہت سے علمی اختلافات مسالک وفقہی وکلامی مکاتب فکر کے باوجود ہمیشہ اہل بیت پیغمبر اکرم صلوات اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں خصوصی نظر رکھتے تھے اور انھیں تمام اصحاب، تابعین اور فقہا سے برتر جانتے رہے ہیں۔ حدیث، فقہ اور تاریخ کی کتابیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں اور اگر اموی وعباسی عہد کے حکام کی ظالمانہ اور فریب کارانہ سیاستیں نہ ہوتیں تو ان کے لئے یہ بلند، عمیق اور استوار مرتبہ ملت اسلام کے دل اور افکار میں یوں ہی باقی رہتا۔

اموی اور عباسی منحرف حکومتوں نے حقائق وواقعیات کو الٹا ظاہر کرنے کی بڑی کوششیں کیں تا کہ نگاہوں کو اہل بیتؑ کی مرکزی حیثیت سے موڑ کر دوسروں کی طرف متوجہ کر دیں۔

ہم یہاں طول کلام سے پرہیز کرتے ہوئے صرف بعض بزرگ صحابہ، تابعین اور فقہا کی اہل بیتؑ کے سلسلہ میں شہادتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ گواہیاں ثابت کرتی ہیں کہ اہل بیتؑ کے بارہ میں کتاب وسنت میں وارد شدہ نصوص نیز مسلمانوں کے غیر جانبدارانہ نظریئے ان کی تاریخی زندگیوں کے حقائق سے پوری طرح ہم

آہنگی اور مطابقت رکھتے ہیں۔

عصر خلفاء میں امام علیؑ کا علمی مقام

۱۔ زمانۂ خلافت ابوبکرؓ میں:

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی درخشاں زندگی کے زمانہ سے گزر کر عصر خلفا میں دیکھتے ہیں کہ ابوبکرؓ، اسلامی معاشرہ پر چھائے ہوئے ان تمام پیچیدہ حالات کے باوجود بہت سے مشکلات، سیاسی مسائل، شرعی احکام، من جملہ اہل ردہ سے قتال کے سلسلہ میں امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے رجوع کرتے اور ان سے مشورہ کرتے تھے۔[۱]

۲۔ خلافت عمرؓ کے زمانہ میں:

خلیفۂ دوم عمرؓ ابن خطاب بھی ہمیشہ کلامی فقہی، اجتماعی و سیاسی مسائل میں حضرت علی علیہ السلام کی طرف رجوع کرتے تھے اور سب سے زیادہ اس حقیقت کو بیان کرتے تھے۔[۲] حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے بارہ میں عمرؓ ابن خطاب کا بیان ظاہر کرتا ہے کہ وہ تمام مسلمانوں سے زیادہ امام علی علیہ السلام کی شخصیت، علم، ایمان اور ان کے بلند مقام کے والہ وشیدا تھے۔ حضرت علی علیہ السلام کے بارہ میں خلیفہ دوم کے بیانات کی چند مثالیں یہاں ذکر کی جاتی ہیں:

۱۔ ''**اعوذ بالله ان اعيش فی قوم لست فيهم يا ابا الحسن**''[۳]

اے ابوالحسن! میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں اس قوم میں رہنے سے جس میں آپ نہ ہوں۔

۱۔ الریاض النضرہ، محبّ طبری، ج۴ص۱۹۵وص۲۲۴۔ کنزالعمال، ج۳ص۹۹و ۳۰۱

۲۔ حدیث وتاریخ کی اکثر کتابیں خصوصاً صحاح وسنن ومسانید اس موضوع کی طرف اشارہ کرتی ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

۳۔ مستدرک الصحیحین، ج۱ص۴۵۷

۲۔ ''لولا علی لهلک عمرؓ''[۱]

اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا۔

۳۔ ''انت (یا علی) خیر هم فتویٰ''[۲]

اے علیؑ! آپ مسلمانوں کے درمیان بہترین فتوا دینے والے ہیں۔

۴۔ '' اللهم لا تنزل لی شدة الاوا ابو الحسن الیٰ جنبی''[۳]

اے خدا! جب ابوالحسن میرے پہلو میں نہ ہوں مجھ پر کوئی سختی نازل نہ فرما۔

۵۔ '' ابا الحسن لا ابقانی الله اشدة لست لها و لا فی بلا لست فیه''[۴]

اے ابوالحسن خدا مجھے اس مشکل کے لئے باقی نہ رکھے جسے حل کرنے کے لئے آپ نہ ہوں اور اس شہر میں باقی نہ رکھے جس میں آپ نہ ہوں۔

۶۔ ''یا ابن ابی طالب فما زلت کاشف کل شبهة و موضع کل حکم''[۵]

اے فرزند ابوطالبؑ آپ ہمیشہ شبہوں کو برطرف کرنے والے اور احکام کو بیان کرنے والے ہیں۔

۷۔ ''اعوذ بالله من معضلة لیس لها ابو الحسن''[۶]

۱۔السنن، بیہقی، ج ؍۷ص ؍۲۴۲۔اس موضوع کی بہت سی حدیث وتاریخ کی کتابوں نے روایت کی۔

۲۔الطبقات، ابن سعد، ج ؍۲ق ص ؍۱۰۲

۳۔کنزالعمال، ج ؍۳ق ص ؍۱۷۹

۴۔کنزالعمال، ج ؍۳ق ص ؍۱۷۹

۵۔کنزالعمال، ج ؍۳ق ص ؍۱۷۹

۶۔نورالابصار، شبلنجی، ص ؍۱۷۱

میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں اس مشکل کے پیش آنے سے جسے حل کرنے کے لئے ابو الحسن، علی، موجود نہ ہوں۔

۸۔ ''لا ابقانی الله بعدک یا علی''[۱]

اے علی! خدا مجھے آپ کے بعد زندہ نہ رکھے۔

یہ تمام اظہارات اس وجہ سے تھے کہ علیؑ، عمرؓ اور دیگر مسلمانوں کی عقیدتی وفقہی مشکلات کو بلکہ غیر مسلمانوں کی مشکلوں کو حل کرنے میں نمایاں کردار ادا کرتے تھے۔

ان واقعات میں سے ایک واقعہ جو زیادہ قابل توجہ ہے، مسلمانوں کے مبداء تاریخ کا موضوع ہے۔
جب عمرؓ ابن خطاب نے مسلمانوں کی تاریخ کا مبداء معین کرنا چاہا تو اس سلسلہ میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے مشورہ کیا آپ نے مشورہ دیا کہ تاریخ کا آغاز پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت سے کیا جائے۔ عمرؓ نے آپ کے مشورہ کو قبول کیا اور اسے عملی جامہ پہنایا۔[۲]

ایک اور موقع پر جب عمرؓ نے ایران کو فتح کرنے کے لئے لشکر بھیجنے کا فیصلہ یا روم کی جانب لشکر کشی کا فیصلہ کیا تو حضرت علی علیہ السلام سے اس سلسلے میں مشورہ طلب کیا جن کا ذکر اکثر کتابوں میں موجود ہے۔

۳۔ عثمانؓ بن عفان کی خلافت کے زمانہ میں

عثمانؓ بن عفان بھی بہت سے عقیدتی وفقہی مسائل ومشکلات میں امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی طرف رجوع کرتے تھے کہ حدیث وفقہ وتاریخ کی کتابوں میں اس کا ذکر صراحت کے ساتھ موجود ہے۔[۳]

۱۔ الریاض النضرۃ، ج۲/ص/۱۹۷

۲۔ بخاری نے اپنی تاریخ میں اور حاکم نے مستدرک الصحیحین، ج۳/ص/۱۴ میں اسے نقل کیا ہے۔

۳۔ الموطأ، مالک ابن انس، ص/۳۶۔ص/۱۷۶۔سنن بیہقی، ج۷/ص/۴۱۹۔مسند شافعی، ص/۱۷۱۔مسند احمد بن حنبل، ج۱/ص/۱۰۰ ص/۱۰۴۔ تفسیر ابن جریر، ج۲۷/ص/۶۱ و۔۔۔

۴۔ علی علیہ السلام کا علم اور عائشہ کا اعتراف

حضرت عائشہ بھی بہت سے شرعی احکام میں جوان سے پوچھے جاتے تھے حضرت علی علیہ السلام کے پاس لوگوں کو بھیجتی تھیں اور کہتی تھی:

''علیک یابن ابیطالب لتسئاله''[۱]

یہ سوال فرزند ابیطالبؑ سے پوچھو۔

یا کہتی تھیں:

''ائت علیا فانه اعلم بذالک منی'' [۲]

علی کے پاس جاؤ کہ وہ اس سلسلہ میں مجھ سے زیادہ عالم ہیں۔

۵۔ حضرت علیؑ اور سعد ابن وقاص

حاکم نے اپنی سند کے ساتھ قیس ابن ابی حازم سے نقل کیا ہے کہ سعد ابن ابی وقاص صحابی۔ پیغمبرؐ۔ نے ایک شخص کو جو حضرت علیؑ سے جھگڑ رہا تھا کہا:

''الم یکن اول من اسلم ؟ الم یکن اول من صلی مع رسول الله (صلی الله علیه و آله و سلم)الم یکن اعلم الناس''؟! [۳]

کیا علیؑ پہلے شخص نہیں ہیں جو ایمان لائے؟ کیا وہ پہلے شخص نہیں ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی ہے؟ کیا وہ سب سے زیادہ صاحب علم نہیں ہیں؟!

۱۔ صحیح النسائی ج/۱ص/۹۶، ص/۱۰۰ص/۱۱۳ص/۱۱۷ص/۱۳۳ص/۱۴۶ص/۱۴۹ص/۲۱۰

۲۔ گزشتہ حوالہ

۳۔ حاکم، مستدرک صحیحین، ج/۳ص/۱۴۹۹ اپنی سند سے قیس ابن حازم سے روایت کی ہے۔

اسی طرح تاریخ گواہی دیتی ہے کہ لقب ''امام'' علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا سب سے مشہور لقب تھا۔

امام حسن علیہ السلام، امام حسین علیہ السلام امام زین العابدین علیہ السلام اور تمام ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے بارہ میں بہت سی گواہیاں ملتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حضرات امت کے علمی مرجع کی حیثیت رکھتے تھے۔

عظیم شعراء کی نظر میں اہل بیتؑ کا علمی مقام

شاید مناسب ترین دلیل اہل بیتؑ اور خصوصا امام زین العابدین علیہ السلام کی مدح میں فرزدق کا قصیدہ میمیہ ہے جس کی چند بیت یہاں نقل کی جاتی ہے:

من معشر حبهم دين و بغضهم

كفر و قربهم منجي و معتصم

مقدم بعد ذكر الله ذكرهم

في كل بدء و مختوم به الكلم

ان عد اهل التقى كانوا ائمتهم

او قيل من خير اهل الارض ؟ قيل : هم [1]

ترجمہ: وہ لوگ جن سے دوستی ایمان اور جن سے دشمنی کفر ہے۔

ان کا قرب نجات دینے اور ہاتھ تھامنے والا ہے۔

ذکر خدا کے بعد ان کا ذکر کرنا مقدم ہے۔

۱۔ وفیات الاعیان، ابن خلکان، ج ۶/ ص ۹۶/

ہر کام کے آغاز اور ہر بات کے انجام میں

جب بھی اہل تقوی کی بات ہو تو یہ افراد اہل تقوا کے پیشوا ہیں

یا اہل زمین کے بہترین لوگوں کا سوال آئے جواب ہوگا کہ یہی لوگ بہترین ہیں۔

ابونواس کے قصیدہ کے چند شعر

ابونواس کے قصیدہ ''رائیہ'' چند شعر جو اس نے اہل بیتؑ کی شان میں کہا ہے:

مطهرون نقيات ثيابهم

تجری الصلاة عليهم اينما ذكر

فالله لما برا خلقا فاتقنه

صفا كم و اصطفاكم ايها البشر

فانتم الملأ الاعلى و عندكم

علم الكتاب وما جاء ت به السور''[۱]

ایسے پاک لوگ جن کے کپڑے پاک ہیں۔

جب ان کا نام لیا جاتا ہے تو زبانوں پر درود جاری ہو جاتا ہے۔

جب خداوند عالم دنیا کو خلق کیا اور استوار کیا،

تو آپ کو انتخاب کیا اے بہترین انسانو۔

بس آپ لوگ ملأ اعلیٰ ہیں اور آپ کے پاس،

کتاب کا علم اور ہر اس چیز کا علم ہے جو قرآن کے سوروں میں ہے۔

۱۔عیون اخبار الرضا، شیخ صدوق، ج۲/ص۱۴۳/۔المناقب، ابن شہر آشوب، ج۴/ص۲۶۶/

۳۔ابوفراس حمدانی کا قصیدہ:

ابوفراس حمدانی کا قصیدہ ''میمیہ'' بھی ان قصیدوں میں سے ہے جس میں اہل بیتؑ کے بہترین اور زیبا عبارتیں اور تعبیریں استعمال ہوئی ہیں۔ہم یہاں اس کے چند شعر ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جو ان حضرات کے علمی پہلو کو نمایاں کرتے ہیں:

الدین مخترم و الحق مهتضم

و فی ء آل رسول الله مقتسم

خلو الفخار لعلا مین ان سئلوا

ویوم السؤال و عمالین ان عملوا

لا یغضبون لگیر الله ان غضوبوا

ولا یضیعون حق الله عن حکموا

تنشا التلاوة من ابیاتهم ابدا

و فی بیوتکم الاوتار و النغم

الرکن و البیت والاستار منزلهم

و زمزم و الصفا و الحجر و الحرم [۱]

دین ہاتھ سے گیا اور حق تاراج ہو گیا ہے

اور خاندان پیغمبرؐ کا حق تقسیم ہو گیا ہے

تمام افتخارات ان لوگوں کے لئے رکھو جو اہل علم ہیں اگر ان سے سوال کیا جائے۔

۱۔دیوان ابوفراس حمدانی،تحقیق ڈاکٹر محمد بن شریفہ،ص/۱۹۶و۲۰۶

اورسوال کے دن (جواب دینے والے) اور عمل کے وقت عمل کرنے والے ہیں۔

جب وہ غضب ناک ہوتے ہیں تو خدا کے علاوہ کسی اور کے لئے غضب ناک نہیں ہوتے اور فیصلہ کے وقت اللہ کے حق کو ضائع نہیں کرتے۔

ان کے گھروں سے ہمیشہ قرآن کی تلاوت کی آوازیں بلند رہتی ہیں

اور تمھارے گھروں سے تاروں اور گانے والوں کی آوازیں۔۔۔[1]

رکن، خانہ خدا اور امتار ان کی منزلیں ہیں۔ اور

زمزم، صفا حجر اور حرم ان کے مقامات ہیں۔

یہ تعبیریں حقیقت میں اہل بیتؑ نبوت کی بلند منزلت و مقام کے سلسلہ میں عوام کے رخ کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اہل بیتؑ کے سلسلہ میں یہ نقطہ نظر صرف شاعروں اور عوام سے مخصوص نہیں ہے، بلکہ عظیم فقہا اور اسلامی مذاہب کے ائمہ بھی اہل بیتؑ کے سلسلہ میں یہی نقطہ نگاہ رکھتے ہیں۔ میری بات کے گواہ محمد ابن ادریس شافعی کے یہ شعر ہیں:

آل النبی ذریعتی

وهم اليه وسيلتی

ارجوا بهم اعطی غداً

بیدی الیمین صحیفتی [2]

خاندان پیغمبرؐ میری دستگیری کرنے والے ہیں

وہ لوگ خدا سے میرے تقرب کا وسیلہ ہیں

مجھے امید ہے کہ اس ذریعہ سے کل قیامت کے دن

میرا نامۂ عمل میرے داہنے ہاتھ میں دیں گے

۱۔ یہاں شاعر کی مراد بنی عباس ہیں۔

۲۔ الصواعق المحرقہ، ابن حجر ص/۱۰۸، نور الابصار ص/۱۰۵

مذہب کے پیشواؤں کے نزدیک اہل بیتؑ کی منزلت

اسلامی مذاہب کے بہت سے ائمہ اور بڑے بڑے فقہا نے ائمہ اہل بیتؑ خاص طور سے امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں زانوئے ادب تہ کیا ہے اور شاگردی کی ہے۔ حافظ ابن عقدہ نے ایسے چار ہزار فقہا و محدثین کا ذکر کیا ہے جنہوں نے یا حضرت سے روایت نقل کی ہے یا ان کی خدمت میں درس حاصل کیا ہے۔[1]

نیز اس نے بہت سی کتابیں اور تصنیفیں بھی ان افراد کی شمار کی ہیں۔ ان افراد میں سے چند یہ ہیں:

''مالک ابن انس اصبحی، ابوحنیفہ نعمان ابن ثابت [2]، یحییٰ ابن سعید، ابن جریج، سفیان ثوری، شعبہ ابن حجاج، عبداللہ ابن عمرؓو، روح ابن قاسم، سفیان ابن عینیہ، اسماعیل ابن جعفر، ابراہیم ابن طحان وغیرہ''[3]

ابوحنیفہ کا یہ کلام ''**لولا السنتان لهلك النعمان** ''[4] اگر وہ دو سال نہ ہوتے تو نعمان ہلاک ہو جاتا، ان دو برسوں کی طرف اشارہ ہے جو انہوں نے امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں گزارے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ائمہ اہل بیتؑ اس زمانہ کی اسلامی امت کی علمی فضا پر کس قدر اثر انداز تھے۔

مالک ابن انس کا یہ کلام بھی اس بات کی دوسری گواہی ہے:

''ما رأت عين ولا سمعت اذن ولا خطر علی قلب بشر افضل من جعفر ابن محمد الصادق علماً و عبادةً وورعاً'' [5]

نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، اور نہ کسی انسان کے دل میں یہ خیال گزرا کہ کوئی شخص جعفر ابن محمد صادقؑ سے علم، عبادت اور ورع و پرہیزگاری افضل ہو۔

۱۔ الرجال، ابن عقدہ زیدی، نقل از اعیان الشیعہ، سید محسن امین، ج۱/ص/۶۶۱

۲۔ طبقات، اعلام اور تاریخ کی زیادہ تر کتابوں مثلاً مطالب السؤل، ابن طلحہ شافعی، ص/۲۱۸ صواعق محرقہ ص/۳۰، نے اس بات کا ذکر کیا ہے۔

۳۔ حلیۃ الاولیاء۔ ابونعیم، نقل از مناقب، ابن شہر آشوب، ج۴/ص/۲۴۷

۴۔ تحفہ آلوسی ص/۸، اور دوسرے تاریخی مصادر۔ قصۃ التقریب، محمد تقی قمی۔

۵۔ تہذیب التہذیب، ج۲/ص/۱۰۴

ابوزہرہ کا کلام

شیخ محمد ابوزہرہ، الازہر یونیورسٹی کے استاد، نے اس حقیقت کی یوں وضاحت کی ہے:

''کان ابو حنیفه یروی .....والقرایة الهاشمیه والعترة المحمدیه''[۱]

ابوحنیفہ امام صادقؑ سے روایت کرتے تھے اور انھیں لوگوں (علماء) کے علمی اختلاف میں سب سے بڑا عالم وفقیہ سمجھتے تھے۔

مالک بھی راوی وشاگرد کی حیثیت سے ان کی خدمت میں آیا جایا کرتے تھے اور جو شخص ابوحنیفہ اور امام مالک پر استاذی کا حق رکھتا ہے، اس کا مرتبہ کامل وتمام ہے، ممکن نہیں ہے کہ وہ دوسروں سے پیچھے رہ جائیں یا کوئی فضیلت میں ان پر برتری حاصل کرلے۔

اس سے بالاتر وہ علی ابن الحسین امام زین العابدینؑ کے پوتے ہیں جو فضیلت وشرف اور دین ودانش میں اپنے زمانے میں اہل مدینہ کے سپہ وسردار تھے نیز ابن شہاب زہری اور بہت سے تابعین ان کے شاگرد تھے۔

آپ محمد باقرؑ کے فرزند تھے جنھوں نے علم کو شگافتہ کیا اور اس کے مغز تک پہنچ گئے۔ وہ ایسے تھے کہ خداوند عالم نے ذاتی اور نسبی شرف کو ان میں جمع کردیا تھا۔ بنی ہاشم کی طرف سے بھی اور عترت پیغمبرؐ ہونے کے اعتبار سے بھی۔

علوم اہل بیتؑ کے علمی جلوے

ائمہ اہل بیتؑ کی زندگیاں علمی گفتگوؤں سے بھری ہوئی ہیں۔ یہ حضرات اس میدان کے بھی شجاع وفاتح تھے، اور جو آداب اور طریقے قرآن مجید نے علمی گفتگو ومناظرہ کے ترسیم کئے تھے انھیں مجسم کرتے تھے۔ ائمہ علیہم السلام کی مجلسیں یا جس مجلس میں وہ شرکت کرتے تھے، مناظرہ واستدلال کا میدان ہوا کرتی تھی۔ البتہ ان حضرات کا

۱۔ الامام جعفر صادق، ابوزہرہ ص/۳

اندازان گوناگوں مجلسوں کے متناسب ہوا کرتا تھا۔ بعض مناظروں کو حکام وقت اوران کے دشمن انھیں آزار واذیت پہنچانے کے لئے منعقد کرتے تھے اور بعض مناظرے علمی فضا میں اور حقیقت تک پہنچنے کے لئے ہوتے تھے، اور بعض مناظرے اس حالت میں ہوتے تھے جب دوسرے۔ حکام یا فقہا۔ مخالفان اسلام کے سوالوں کا جواب دینے سے عاجز ہوجاتے تھے اور ائمہؑ سے اس سلسلہ میں طلب کرتے تھے۔ کچھ مؤلفین نے ان مناظروں کو اپنی کتابوں میں اصل مآخذ کے حوالہ کے ساتھ جمع کیا ہے۔ا

ان تمام علمی گفتگوؤں اور مناظروں میں اور دوسرے لفظوں میں وہ بات جو ہمارے لئے بہت اہمیت رکھتی ہے اور مفید ہے یہ ہے کہ ائمہ طاہرین علیہم السلام کسی ایک مناظرہ میں شکست سے دو چار نہیں ہوئے اور نہ دشواری میں مبتلا ہوئے۔ جب کہ ان میں سے بعض حضرات، مثلاً امام محمد تقی علیہ السلام عمر کے اعتبار سے بہت کمسن تھے۔ آپ کا سن مبارک نو سال سے زیادہ نہ تھا اس کے باوجود علمی اور بلند مناظروں میں اپنے رقیبوں پر کامیاب ہوئے۔ ان مناظروں کی بہت بلند سطح ائمہ اہل بیتؑ کی بلا اختلاف علمی مرجعیت کو ثابت کرتی ہے۔

امام علی علیہ السلام کے مناظرے

سب سے پہلے شخص جو مخالفوں کے ساتھ مناظرہ کے میدان میں اترے امام علی ابن ابیطالب علیہ السلام تھے، کہ مختلف ادیان کے پیروؤں خصوصاً یہودیوں، عیسائیوں، زرتشتیوں وغیرہ سے گفتگو آپ کی زندگی کا حصہ بن گئی تھی۔ ۲ اس کے علاوہ آپؑ نے اہل غلو سے بھی گفتگو کی تاکہ انھیں توبہ پر آمادہ کریں، اوران سے بھی گفتگو کی جو آپ کی خلافت کی مخالفت کر کے امت اسلام سے خارج ہو گئے تھے۔

حضرت علی علیہ السلام لوگوں کو شوق دلاتے تھے کہ عقائد و احکام اور نظری وطبیعی علوم سے متعلق تمام موضوع میں ان سے سوال کریں اور بہت فرمایا کرتے تھے: ''سلونی قبل ان تفقدونی''۳

ا۔منجملہ کتاب''الاحتجاج''طبری

ا۔نمونہ کے لئے کتاب''عرائس التیجان''،ثعلبی،ص/۵۶۶ کی طرف رجوع کریں۔

۲۔اسی عنوان کی کتاب تالیف شیخ محمد رضا حکیمی، ملاحظہ ہو۔

اس سے پہلے کہ مجھے ہاتھ سے گنوادو اپنی علمی مشکلوں کو مجھ سے پوچھ لو۔

حضرت علی علیہ السلام کے بیٹوں حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ نے بھی اسی روش پر زندگی گزاری۔

امام حسن علیہ السلام کے مناظرے

ایک شامی شخص سے امام حسنؑ کا مناظرہ جو معاویہ کی طرف سے رومی عیسائی علماء کے سوالات لے کر آیا تھا کہ حضرت علیؑ کو مشکل میں مبتلا کرے۔ امامؑ نے ان سوالوں کا جواب دینے کے لئے انھیں امام حسنؑ کے حوالے کیا اور امام حسنؑ نے اس شامی کے تمام، دینی، علمی، اور فلسفی سوالوں کا مناسب علمی جواب دیا۔[1]

قضا و قدر کے بارہ میں امام حسین علیہ السلام کا حسن بصری سے مناظرہ بھی اسی نوعیت کا ہے اور دلچسپ ہے۔[2]

امام جعفر صادق علیہ السلام کے مناظرے

ہماری گفتگو طولانی نہ ہونے پائے، اس لئے ہم امام صادق علیہ السلام کے مناظروں کے صرف دو نمونہ یہاں ذکر کرتے ہیں:

امام علیہ السلام نے خاص تاریخی حالات میں زندگی بسر کی ہے لہٰذا آپ کے مناظرات بھی طولانی اور بہت زیادہ ہیں۔ ان میں سے ایک ابو حنیفہ نعمان ابن ثابت سے مناظرہ ہے جو عباسی خلیفہ منصور دوانقی کی زبردستی انجام پایا۔ ابو حنیفہ خود کہتا ہے:

میں نے جعفرؑ ابن محمدؑ سے بڑھ کر کسی کو عالم نہیں پایا۔ جب منصور نے آپ کو اپنے دربار میں بلایا تھا تو کسی کو اس نے میرے پاس بھیجا اور کہا: اے ابو حنیفہ! لوگ جعفر ابن محمد علیہ السلام کے شیفتہ ہوئے جا رہے ہیں، لہٰذا تم سخت اور مشکل سوالات ان سے پوچھنے کے لئے آمادہ کرو۔ میں نے چالیس سوال تیار کئے۔

۱۔ الاحتجاج طبرسی، ص ۲۶۷؍و۲۶۹

۲۔ تحف العقول عن آل رسولؐ، ابن شعبہ حرانی، ص ۲۳۱؍

پھر جب خلیفہ ''حیرہ'' میں تھا تو اس نے مجھے بلایا۔ میں جب اس کے پاس گیا تو جعفرؑ ابن محمدؑ اس کے داہنی سمت بیٹھے ہوئے تھے۔ جب میری نگاہ جعفرؑ ابن محمدؑ پر پڑی تو مجھ پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ منصور کو دیکھنے سے وہ ہیبت مجھ پر طاری نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سلام کیا۔ اس نے اشارہ کیا میں بیٹھ گیا۔ منصور نے ان کی طرف رخ کر کے کہا: اے ابا عبداللہ! یہ ابوحنیفہ ہیں۔ پھر مجھ سے کہا، تم اپنے سوالات ان سے پوچھو۔ میں نے سوال کرنا شروع کئے، وہ جواب دیتے جاتے تھے اور فرماتے تھے: تم ایسا کہتے ہو، اہل مدینہ کی رائے یہ ہے اور ہم یہ کہتے ہیں ۔۔۔!

کبھی ہم سے ہم عقیدہ ہو جاتے تھے اور کبھی اہل مدینہ سے اور کبھی ہم سے مخالفت کا اظہار کرتے تھے۔ میں نے ان سے چالیس سوال پوچھے اور انھوں نے ان سے کا بہترین اور مدلل جواب دیا۔

اس کے بعد ابوحنیفہ کہتا ہے: ''**السناد و نیا ان اعلم الناس اعلمھم باختلاف الناس**''۔[1]

''کیا ہم نے روایت نہیں کی کہ لوگوں میں سب سے زیادہ علم والا وہ ہے جو لوگوں کے اختلاف رائے میں ان سے زیادہ علم رکھتا ہو؟''

امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک دوسری گفتگو اور مناظرہ بھی ہے جو آپ نے زندیقوں کے رہبر سے مختلف دینی و فلسفی علوم اور تمام ادیان کے آراء و عقائد سے متعلق انجام دیا۔ امام علیہ السلام کے جوابات اس بات کا سبب بنے کہ وہ زندیق ایمان لے آیا اور مسلمان ہو گیا۔[2]

امام علی رضا علیہ السلام کے مناظرات

امام علی رضا علیہ السلام نے عیسائی، یہودی، صابئی اور مجوسی علماء و متکلمین سے بڑی طولانی گفتگو اور مناظرے کئے ہیں کہ بہت سے مورخوں نے ان کی تصدیق کی ہے۔

۱۔ یہ بات ''موفق'' نے ''مناقب ابوحنیفہ'' نامی کتاب، ج ۱ ص ۱۷۳ میں نقل کی ہے۔
۲۔ الاحتجاج، ص ۳۳۱ و ۳۳۵

فضل ابن سہل وزیر مامون نے خلیفہ کے حکم سے ان سب کو بلایا اور ان سے کہا کہ مامون کے حضور میں وہ سب امام سے مناظرہ کریں۔ اس عظیم مناظرہ کے نتیجہ میں بہت سے علماء و متکلمین امام کے ہاتھوں پر مسلمان ہوئے۔[1] مناظرہ کے خاتمہ پر خود مامون نے مختلف موضوع سے متعلق امام سے سوالات کئے۔[2] ہر ایک سوال کا جواب سننے کے بعد مامون کی حیرت اور تعجب میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ تعجب بھی خوف وہراس کے ساتھ کہ اگر لوگ ایسے عالم کی طرف متوجہ ہو گئے تو عباسیوں کی حکومت کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔

امام جواد علیہ السلام کا مناظرہ

سب سے زیادہ حیرت انگیز مناظرہ امام جواد علیہ السلام اور مامون کے قاضی القضاۃ یحیٰ ابن اکثم کا مناظرہ ہے۔ اس وقت امام علیہ السلام کی عمر صرف نو سال تھی۔ درحقیقت مامون اپنے نزدیکی افراد سے امام علیہ السلام کے علم کے سلسلہ میں شرط لگائی تھی اور اس طرح وہ آپؑ کو اس کمسنی میں آزمانا چاہتا تھا۔[3]

جب مامون کی مجلس میں حکومت کے تمام عہدہ دار، علماء، راویان، اور عباسی حکومت کی بڑی بڑی شخصیتیں اکٹھا ہو گئیں تو یحیٰ ابن اکثم نے ایک مختصر سا سوال امام محمد تقی علیہ السلام سے پوچھا کہ ''اس شخص کا حکم کیا ہے جس نے احرام کی حالت میں شکار کیا ہے'' امامؑ نے اس کے جواب میں خود اس سے پوچھا:

یہ شکار حرم میں ہوا تھا یا حرم سے باہر؟

وہ مسئلہ کو جانتا تھا یا اس سے جاہل تھا؟

اس نے عمداً شکار کیا تھا یا غلطی سے؟

محرم بندہ تھا یا آزاد؟

۱۔ گزشتہ حوالہ، ص ۴۱۵ و ۴۲۵

۲۔ گزشتہ حوالہ، ص ۴۳۲ و ۴۲۵

۳۔ الاصول العامہ للفقہ المقارن، سید محمد تقی حکیم، ص ۱۸۳

وہ شخص چھوٹا تھا یا بڑا؟

اس نے پہلی بار شکار کیا تھا یا کئی بار کر چکا تھا؟

شکار پرندہ تھا یا کچھ اور؟ چھوٹا تھا یا بڑا؟

اب بھی وہ اپنے عمل پر اصرار کرتا ہے یا اس سے پشیمان ہے؟

اس نے رات میں شکار کیا تھا یا دن میں؟

شکار کرتے وقت اس نے عمرہ کا احرام باندھا تھا یا حج کا ؟

یحیٰ ابن اکثم نے بڑی حیرت کے ساتھ اپنی علمی ناتوانی اور سرگردانی کا اظہار کیا۔ اس وقت مامون نے امام جواد علیہ السلام سے درخواست کی کہ مسئلہ کے ہر گوشہ کا جواب آپ خود عنایت فرمائیں۔ امام علیہ السلام نے اس طرح سے ان سب کا جواب ایک ایک کر کے دیا کہ یحیٰ اور بقیہ افراد کے ذہنوں سے ان کی کمسنی اور نادانی کا تصور بالکل ختم ہو گیا۔[۱]

شائد یہی ایک مناظرہ اور اس کے درخشاں نتائج شیوۂ مناظرہ کی اہمیت اور اس کی تاثیر کی شکل میں اہل بیت علیہم السلام کی علمی مرجعیت کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہو جو زمان و مکان اور ان کی کمسنی کے باوجود امت اسلامیہ میں ان کی علمی مرکزیت کو ثابت کرتے ہیں۔

ایک فقیہ کی تعبیر میں [۲] تمام مناظروں اور علمی گفتگوؤں میں دائمی اور مکمل کامیابی جو اکثر موقعوں پر صرف امتحان کے لئے ہوا کرتی تھیں اتفاقی نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ اتفاق بعض لوگوں کے لئے اور بعض میدانوں میں ہی پیش آتا ہے، لیکن ان کامیابیوں کا پے در پے متعدد بار مختلف میدانوں میں، تمام ائمہؑ کے لئے بزرگی یا کمسنی میں وجود میں آنا کسی صورت سے اتفاقی نہیں ہوسکتا۔

۱۔ الصواعق المحرقہ، ص۲۰۴۔ الاحتجاج، ص۴۴۴

۲۔ الاصول العامہ للفقہ المقارن، سید محمد تقی حکیم، ص۱۸۴

تقریب کی اسٹریٹجی

ڈاکٹر محمد رضا رضوان طلب (تہران یونیورسٹی بورڈ کے رکن)

ترجمہ: سید قلبی حسین رضوی

خلاصہ

مذاہب اسلامی کی تقریب کی ضرورت کے سلسلہ میں اب تک بہت سے مقالات تدوین اور شائع ہوئے ہیں اور اس سلسلہ میں متعدد کانفرنسیں اور نشستیں منعقد کی گئی ہیں جن میں اکثر تاکیدی پہلو پایا جاتا تھا۔ اب ایسا لگتا ہے کہ اس واضح شدہ امر سے ذرا ہٹ کر تقریب کی راہ پر چند عملی اقدام انجام دیں۔ اس مقالہ میں تقریب اور اسٹریٹجی کے معانی کی دو بنیادی مفاہیم کے اعتبار سے دقیق تعریف پیش کرتے ہوئے ان کے مقاصد کی تحقیق اور تقریب مذاہب اسلامی کو عملی جامہ پہنانے کے کم از کم بیس طریقہ کار پیش کئے گئے ہیں اور آخر میں مختلف مذاہب کے درمیان تقریب اور ہماہنگی کو عالم اسلام کے لئے ایک حتمی منظر کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔ اور مخالفین اور دشمنوں کو اس آفتاب جیسی حقیقت کی مخالفت سے روکا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ

اسٹریٹجی ،تقریب ، اسلامی مذاہب ، مقاصد ، اختلاف ، اتحاد ، فتنہ ، تشیع ، تسنن ، تشنج سے پرہیز ، تہمت ، برأت ، عالم اسلام ،تفرقہ ۔

شاید جس اسٹریٹجی کا جو مفہوم ہمارے ذہن میں موجود ہے اس کی روشنی میں پرانے شجرہ تقریب ،[1] کی حکمت عملی کی جانچ پڑتال کو تاخیر سے انجام دیا جارہا ہو،لیکن ہم حکمت عملی کے معنی ومفہوم کی تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ یہ بحث دورہ کی صورت میں ، بلکہ سالانہ اور گونا گوں تغییرات کے مطابق پیش کرنے کے قابل اور مکمل طور پر قابل استفادہ اور غیر تکراری ہے۔اس بنا پر ہم پہلے اسٹریٹجی کے معنی پر بحث کریں گے اور اس کے بعد تقریب ،اس کے مقاصد اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے طریقوں پر بحث کریں گے۔

اسٹریٹجی کا معنی:

مختلف لغات کو پرکھنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لفظ اسٹریٹجی [Strategei (فرانسیسی) Strategy (انگریزی)] ایک ایسی اصطلاح ہے جس نے فوجی ماحول میں جنم لیا ہے اور لاطینی لفظ Stratos سے لیا گیا ہے جس کا معنی فوج ہے اور لفظ Agein کا معنی کمانڈ کرنا ہے۔لیکن لغت لکھنے والوں نے اس کے گونا گوں معانی کئے ہیں اور ناظموں نے اسے عام انتظامیہ کے امور اور اس کے پروگراموں میں استعمال کیا ہے۔اس کی سب سے مختصر تعریف یہ ہے ’’مخصوص اور معین مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے کلی سیاست یا روش‘‘ (آقا بخشی وافشاری ،ص ۵٦٨)

اس لئے اسٹریٹجی کو پہلے سے معین کرنے کی ضرورت ، مقصد کا معین کرنا ہے اور اس کے ساتھ جزئی

ا۔مصر میں ١٩٤٦ء میں مرحوم علامہ محمد تقی قمی نے بعض اساتید اور اس زمانے کے الازہر یونیورسٹی کے صدر شیخ مصطفیٰ عبدالرزاق کے تعاون سے دار التقریب کی بنیاد ڈالی تھی۔

پروگرام، عملی جامہ پہنانے کا خاکہ، عملی کام کی توصیف اور ضروری امکانات و وسائل کی فہرست مرتب کرنا ہے۔

فرانس کے معروف اسٹریٹجسٹ '' جنرل آندرے بوفر (Andre beaufer) اپنی کتاب (Introductiona la strategie) ''اسٹریٹجی کے مقدمہ'' میں کہتے ہیں:

''اسٹریٹجی ایک ایسا فن ہے جو ہر کارزار کی دشواریوں پر وسائل و امکانات کے بارہ میں غور وفکر سے پہلے قابو پانے کا امکان فراہم کرتا ہے''

ایک مثال کے ذریعہ اسٹریٹجی کا مفہوم اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے کہ ایک مشخص جغرافیائی نقطہ کی طرف روانہ ہونے کے سلسلہ میں، مقصد کو معین کرنا، وسائل فراہم کرنا، راستہ اور سفر کی ضروریات کو پورا کرنا یہ سب اسٹریٹجی سے خارج اور اس کا مقدمہ ہے اور خود اسٹریٹجی یہ ہے کہ ہم پیشگوئی کریں کہ ہمیں کس رفتار سے چلنا ہے تاکہ راستہ کے اتار چڑھاؤ میں رکاوٹوں سے دوچار نہ ہوں نیز رات اور خطرات پیدا کرنے والے عوامل سے دوچار نہ ہوں اور راستہ سے منحرف نہ ہو جائیں وغیرہ۔

اس لئے، اسٹریٹجی کو ایسی تدابیر کے معنی میں لیا جا سکتا ہے جو ایک پروجیکٹ کو خطرات، دشواریوں یا رکاوٹوں اور مشکلات کے مقابل میں انفعال سے بچا سکتی ہیں سیاسی علوم کے دانشوروں کا اعتقاد ہے کہ صدر جمہوریہ اور سیاستدان ملک کے محنت کش طبقہ سے نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر وہ زیادہ کام کریں تو وہ ان کی کمزوری اور اسٹریٹجی کے فقدان کی علامت ہے۔ اصولی طور پر انھیں کوئی کام انجام نہیں دینا ہوتا ہے۔ ان کا کام اسٹریٹجی کو معین اور کنٹرول کرنا ہوتا ہے اگر کسی ملک کا نظام اچھی طرح سے چلتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لئے اچھی اسٹریٹجی منتخب کی گئی ہے۔

ایک اور نکتہ جو تقریب کی اسٹریٹجی کو سمجھنے میں دخیل ہے، وہ یہ ہے کہ یہ مفہوم مضافی مفاہیم میں سے ہے جو مضاف الیہ کی شناخت پیدا کرنے سے قابل ادراک اور لائق تشخیص ہے واضح ہے کہ عسکری اسٹریٹجی، ترقی یافتہ

اسٹریٹجی، بیکار کرنے والی اسٹریٹجی، مقابلہ آرائی کی اسٹریٹجی اور باز رکھنے والی اسٹریٹجی میں سے ہر ایک کی اپنی خاص تعریف ہے۔ اس لئے اسٹریٹجی کے معنی کو جاننے کے ضمن میں تقریب اور اس کے مقاصد کو بھی جاننا ضروری ہے اور ہم اس مقالہ میں ان میں سے ہر ایک کی طرف اشارہ کریں گے۔

تقریب کیا ہے؟

حالیہ صدیوں کے تقریب کے عظیم معمار مرحوم علامہ محمد تقی قمی کہتے ہیں: ہمارا مقصد فقہی مذاہب کو ایک دوسرے میں مدغم کرنا نہیں ہے، کیوں کہ اختلاف ایک فطری امر ہے۔ اور اس قسم کے اختلافات میں کسی قسم کا نقصان نہیں ہے بلکہ وسعت فکری اور رحمت الٰہی فراہم ہونے کا سبب بن جاتے ہیں'' (علامہ قمی، ص/۶۶)

بیشک مذاہب کی تقریب، تمام مذاہب کو ایک کرنے یا کسی مذہب کو کسی دوسرے مذہب میں مدغم کرنے کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ لغت میں لفظ تقریب باب تفعیل سے ہے اور اس کا معنی ایک دوسرے سے دور ہوئی دو چیزوں کو آپس میں نزدیک لانا ہے۔ اس لئے ابتداء میں تبعید کے مفہوم کا تصور پیدا ہوتا ہے اور پھر تقریب تشکیل پاتی ہے۔ تقریب کا لفظ سابقہ نفرت و دوری کی طرف ایک اشارہ کرتا ہے جو فکری اختلاف اور رائے و نظر کا فرق نہیں ہے، بلکہ اس کا سبب عقائد میں دوگانگی اور قلبی نیز مقابل کی طرف سے عداوت و دشمنی کا احساس ہے۔

اگر دو شخص کسی مقرر کی تقریر کو کیسٹ سے سنیں اور اس مقرر تک ان کی رسائی نہ ہوتا کہ اشکالات وابہامات کو دور کر سکیں۔ اگر یہ دونوں شخص مقرر کی تقریر کی گہرائیوں اور علمی بحث کے بارے میں اتفاق نظر رکھتے ہوں اور آپس میں ایک دوسرے کے بارے میں بھی بدظنی نہ رکھتے ہوں اور دونوں شخص مقرر کی تقریر کے مقصد کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں اور اس کے نظریات کی پیروی کرنا چاہیں، لیکن بعض جزئیات میں اس کے بیان کے بارے میں جدا جدا تصور رکھتے ہوں تو یہ اختلاف نظر کسی قسم کی دشمنی اور عداوت پیدا نہیں کر سکتا ہے بلکہ پورے اخلاص کے ساتھ ہر ایک دوسرے کے نزدیک اپنا اپنا عقیدہ اور نظریہ رکھ سکتا ہے اور یہ فرق ایک فطری امر ہے اور ضروری نہیں

ہے کہ ان دونوں کو ان جزئیات کے بارے میں متحد کرنے کی کوشش کی جائے ۔ جو کچھ مفید بلکہ ضروری ہے ۔ وہ یہ ہے کہ یہ نظریاتی اختلافات، دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کے نتیجہ میں عداوت و کینہ میں تبدیل نہ ہوں اور انھیں فکری و اعتقادی اختلافات کا رنگ نہ دیا جائے ۔ دو افراد کی آپسی ہماہنگی، مفاہمت، احترام کو ٹکراؤ اور لڑائی میں تبدیل نہ کیا جائے اور اس طرح اصل پیغام تحریف و تبدیلی کا شکار نہ ہو جائے ۔

حق کی تلاش میں قدم رکھنے والے ان دو افراد کے درمیان کشمکش اور ٹکراؤ پیدا ہونے کی صورت میں، تقریب کے عنوان سے درج ذیل اقدامات کئے جا سکتے ہیں:

۱۔ ان دونوں کے درمیان مشترک اعتقادات کا بیان کرنا اور ان کا اہمیت کے مطابق اختلافی موارد سے تطبیق کرنا۔

۲۔ اصل پیغام کی حفاظت کے سلسلہ میں اختلافات اور لڑائی کے نتائج پر غور کرنا۔

۳۔ مقابل کے نظریہ کی قابل قبول توجیہ کرنے کی کوشش کرنا۔

۴۔ ان اختلافات کو ایک لڑائی اور کشمکش میں تبدیل کرنے والے پس پردہ عناصر کے چہروں سے نقاب الٹنا اور ان کے مقاصد کو ظاہر کرنا۔

۵ ۔ پیغام دینے والے کے مقاصد کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے سلسلہ میں خاموشی اور صبر و تحمل کے اچھے نتائج کو مد نظر رکھنا۔

مذکورہ مطالب اور اسی قسم کے دسیوں مطالب جن کے بارے میں تقریب کے عملی اقدام کے باب میں اشارہ کیا جائے گا، تقریب کی وہ کارروائیاں ہیں جو طرفین کے درمیان پیدا ہوئے فاصلہ اور دوری کو کم کرتی ہیں اور بدظنی و دشمنی کے موضوع کو ختم کر دیتی ہیں ۔ لیکن وہ تدابیر جو اس قسم کی کشمکش اور ٹکراؤ کو روک سکیں، یا ٹکراؤ کے وجود میں آنے کی صورت میں تقریب کو وجود میں لانے اور ٹکراؤ کو دور کرنے کے اقدامات انجام دیں اور اختلافات اور ٹکراؤ کو وجود میں نہ آنے دینے کے لئے قبل از وقت اقدامات انجام دینے نیز رکاوٹوں اور بدظنیوں کو دور کرنے کے

لئے اپنائی جانے والی حکمت عملی کوتقریب کی اسٹریٹجی کہا جاتا ہے۔

قطر یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر محمد الدسوقی کہتے ہیں: ''اسلامی مذاہب کو باہم نزدیک لانا، یعنی تعصّبات کو دور کرنے کی کوشش کرنے اور امت مسلمہ کو مشترک اعتقادات، عقائد اور دین کی بنیادوں اور ایک کلمہ پر متحد ہونے کی دعوت دینا تقریب کی اسٹریٹجی ہے'' (علی دروب التقریب، ص/۵۴)

مذکورہ پروفیسر کے ساتھی ڈاکٹر احمد عبدالرحیم السائح کہتے ہیں: اسلامی مذاہب کے درمیان تقریب، یعنی ان اسلامی اصولوں کی بنیاد پر ملت اسلامیہ کا اتحاد، جن کے قبول کئے بغیر ایک انسان مسلمان نہیں ہوسکتا ہے اور ان بنیادی اصولوں کے علاوہ دوسری چیزوں پر ہمارا نظریہ ٹکراؤ پر مبنی نہیں ہونا چاہئے بلکہ تحقیقی اور معرفت کی تلاش پر مبنی ہونا چاہئے۔ (ایضاً ص/۶۵-۶۳)

اس کے وہ تمام مسلمانوں کے مشترک نکات، یعنی خدائے واحد، پیغمبرؐ واحد، قبلہ واحد، قانون اور کتاب واحد اور ان سب کے درمیان پانچ معروف اصول اور مسلمانوں کے تمام فرقوں کے قیامت پر اعتقاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ان مشترکات پر پابندی ہمیں ایک متحدہ امت قرار دیتی ہے کہ ہمارا مقصد ایک ہے اور ہم یکساں رہبری اور اعتقادی روش کے حامل ہیں۔ کیوں کہ ہم سب اعتقاد رکھتے ہیں کہ زندگی میں ہمارا مقصد اس آیہ شریفہ کی بنیاد پر ہے: ﴿**وما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون**﴾ (الذاریات/۵۶) خدا کی مکمل اطاعت اور بندگی ہے اور اس آیہ شریفہ ﴿**واعتصموا بحبل اللہ جمیعا و لا تفرقوا**﴾ (آل عمران/۱۰۳) سے الہام لیتے ہوئے خداوند متعال کے حکم کے مطابق ہماری روش اتحاد و یکجہتی ہے اور خدا کے حکم سے ہماری رہبری خاتم الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سونپی گئی ہے اور اصول عقاید میں بھی ہم ہم فکر و متحد ہیں۔ اس لئے جس چیز کی ہمیں ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے پر خطا اور بدعتی ہونے کی تہمت نہ لگائیں''

مرحوم آیت اللہ محمد حسین آل کاشف الغطا بھی اسلامی مذاہب کی تقریب کے بارے میں یوں فرماتے ہیں: ''اتحاد سیرت و کردار کا مقولہ ہے اور فطری خوبیوں اور صفات کے معنی میں، رفتار و کردار اور برجستہ اخلاقی اصولوں کی پائداری و پابندی ہے۔ اتحاد یہ ہے کہ مسلمان اپنی دولت اور سرمایہ سے مشترکہ طور پر قسط و عدل کی بنیادوں پر استفادہ کریں۔ اتحاد کا معنی ایک فرقہ کو دوسرے فرقہ میں مدغم کرنا نہیں ہے اور یہ خلاف عدل وانصاف ہے کہ ہم زوال اور تہمتوں سے دوچار فرقہ کو جو اپنا دفاع کر رہا ہے، اپنا دفاع کرنے کے سبب اس پر تفرقہ اور کینہ پھیلانے کی تہمت لگائیں۔ بلکہ ہمیں اس کی بات پر تحقیق کرنی چاہئے اور اگر وہ حق پر ہو تو اس کی مدد کریں ورنہ استدلال کے ذریعہ اسے مطمئن کریں'' (حول الواحدۃ الاسلامیہ، ص/۳۶)

اسٹریٹجی اور تقریب کی اصطلاح کے باب میں الگ الگ جو وضاحت پیش کی گئی اور تقریب کی سرگرمیوں اور اس کے مصادق کے بارے میں جو اشارے کئے گئے، ان سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ تقریب کی اسٹریٹجی یہ ہے کہ تقریب کو مختلف رکاوٹوں اور مشکلات سے بچانے اور اسے منزل مقصود تک پہنچانے کے لئے عملی سیاست بروئے کار لائی جائے اور اس کے لئے عملی پروگرام کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے تاکہ موجودہ خلا کو پر کیا جا سکے اور آپس میں رونما ہوئے اختلافات اور کشمکشوں کو دور کیا جا سکے اور اسلامی مذاہب کے نصب العین کو حاصل کیا جا سکے اس وضاحت نے واضح کیا کہ جن مجہولات کو ہمیں بیان کرنا چاہئے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ تقریب کا مقصد

۲۔ تقریب کا طریقہ کار اور اسٹریٹجی

۳۔ تقریب کے عملی منصوبے

مذاہب اسلامی کی تقریب کے مقاصد:

۱۔ دین اسلام کو داخلی بکھراؤ سے بچانا

جس دن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبیین کے عنوان سے بیداری کا پیغام پہنچانے کے لئے مبعوث ہوئے، اسی دن سے اس نئے دین کے خلاف مختلف صورتوں میں دشمنیاں اور کینہ توزیاں نمودار ہوئیں۔ کینہ ور ملحد اور مشرکین کبھی اس بات کو نہیں چھپاتے تھے کہ وہ اپنے پرانے دین اور خرافات کی حقارت سے دوچار ہونے پر ناراض اور فکر مند ہیں ورنہ وہ مدعی رسالت اور ان کے پیروؤں سے کوئی اختلاف نہیں رکھتے اور نئے دین کو حذف کرنے اور جدید فکر کے روش کو ختم کرنے کے سلسلہ میں ہر گفتگو حتیٰ پیغمبری کا دعوی کرنے والے کو مال و دولت اور طاقت کے اعلیٰ ترین منصب عطا کئے جانے کی تجویز کا بھی استقبال کرتے تھے۔ اس زمانہ میں دین اسلام کو نابود کرنے کے لئے مختلف طریقوں، من جملہ طمع، دھمکی، جسمانی اذیتوں، ترک موالات اقتصادی ناقہ بندی، نفسیاتی جنگ اور دسیوں دھمکیوں اور فوجی حملوں کا تجربہ کیا گیا۔ لیکن ﴿یریدون لیطفوٴا نور الله با افواھم و اللّٰہ متم نورہ ...﴾ ہر دشمن کے لئے، نفسیاتی جنگ یا داخلی جنگ مقصد تک پہنچنے کا سب سے بے خطر اور فوری طریقہ کار ہوتا ہے، لیکن اسلامی نظام کے ہوشیار اور آگاہ معمار، یعنی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظالم قریش کے چنگل سے آزاد ہونے کے پہلے ہی دن مسلمانوں کے درمیان برادری قائم کرکے، مسلمانوں کے درمیان اختلاف و افتراق پیدا کرنے، مہاجر و انصار، سیاہ و سفید اور غلام و آزاد کے نام سے جنگ و اختلاف برپا کرنے کے دشمنوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

لیکن مختلف بہانوں سے مسلمانوں کے اندر تفرقہ پیدا کرنے کی سیاست اور مسلمانوں کے اذہان میں شک و شبہ ایجاد کرنے کی پالیسی ہمیشہ دشمنوں کے مد نظر رہی ہے اس طرح کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاندانی رفت و آمد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے افراد سے روابط، دوسروں کو ذمہ داریاں سونپنا، مال غنیمت کی تقسیم، صلح و جنگ کے بارے میں فیصلے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر فیصلہ دشمنوں کی شیطنت آمیز نظروں میں ہوتا تھا اور وہ ان سے ناجائز فائدہ اٹھا کر شک و شبہ ایجاد کرنا چاہتے تھے تاکہ داخلی اختلافات کو ہوا دے

کرا پنا الوسیدھا کرسکیں۔ جن لوگوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شدید جذباتی اور ایمانی لگاؤ کا فتح مکہ میں مظاہرہ کر کے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیرینہ دشمن ابوسفیان کو حیرت میں ڈال دیا تھا، کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وحی سے آپ کے رابطہ اور آپ کے ذاتی فیصلوں کے استحکام یعنی ''**ما ینطق عن الهویٰ ان هو الا وحی یوحی**'' کے بارے میں سوال کرتے تھے۔ لیکن بہرحال اسلام کی تازہ تشکیل شدہ حکومت کی طوفان سے دوچار کشتی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکمت عملی اور دوراندیشی سے تمام خطرات کے مقابلہ میں اچھی طرح کنٹرول ہوتی رہی یہاں تک کہ فوجی حملے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے آخر ایام تک آنحضرت صلی اللہ کو فوج کو منظم کر کے جنگ پر روانہ کرنے پر مجبور کرتے رہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر خطرہ سے صحیح وسالم بچ نکلے، یہاں تک کہ سرانجام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خداوند متعال کی تبدیل نہ ہونے والی سنت کے تحت اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔

لیکن کیا یہ مناسب ہے کہ ہم یہ تصور کریں کہ توحید کے منادی کی رحلت کے بعد دشمنوں کی تمام تلاش و کوششیں اور دھمکیاں ختم ہوگئیں اور تمام دشمن اپنی دشمنی سے پشیمان ہوگئے اور اب اسلام اور قرآن مجید آنحضرت کے نام مبارک کو نشانہ قرار دینے کے بجائے مسلمانوں کے ساتھ مفاہمت اور مثبت سوچ اور ترقی یافتہ طریقہ کار اپنانے اور انھیں مدد کرنے پر اتر آئے ہیں؟ یا ہمیں باور کرنا چاہئے کہ ان دشمنوں کے ذہنوں میں اسلام کے چراغ کو خاموش کرنے کے عزائم اب بھی موجود ہیں۔

تنہا شخص، جس نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمنوں کی ریشہ دوانیوں اور دین اسلام کو نابود کرنے کی دشمن کی سازشوں کو اپنی ہوشیاری اور دوراندیشی سے ناکام بنادیا وہ تقریب کے حامیوں کے امام حضرت علی علیہ السلام تھے۔ جیسا کہ آپؑ نے اپنی ایک حکیمانہ تحریر میں یوں فرمایا ہے: میں نے دیکھا کہ لوگوں کا ایک گروہ دین سے منحرف ہوکر دوسروں کو دین خدا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت اور دین حضرت ابراہیم کو نابود

کرنے کی دعوت دے رہا ہے، پس میں ڈر گیا کہ اگر میں اس وقت اسلام کی نصرت نہ کروں، تو اسلام میں رخنہ اندازی ہوگی اور اس کی بنیادیں خراب ہو جائیں گی۔ جو میرے لئے ایک مصیبت ہوگی، اس لئے میں ابوبکر کے پاس گیا اور اسلام کو درپیش خطرات کا مقابلہ کیا یہاں تک کہ باطل نے بوریا بستر گول کیا اور نابود ہو گیا اور اللہ کا نام مبارک دشمنوں کے ناپاک عزائم کے باوجود عظمت پا گیا جب کہ امور کو حل وفصل کرنے کی ذمہ داری ابوبکر سنبھالے ہوئے تھے۔ پس میں نے خیر خواہی کی بنیاد پر ان کا ساتھ دیا اور جس چیز میں خدا کی مرضی تھی، اس میں پوری طاقت کے ساتھ ان کی پیروی کی'' (ثقفی، ۱۳۷۳، ج/۱، ص/۳۰۲، علامہ مجلسی، ج/۲۳، ص/۵۶۸ و ابن ابی الحدید، ج/۶، ص/۹۵)

الازہر یونیورسٹی کے پروفیسر علامہ ڈاکٹر عبدالمتعال صعیدی کہتے ہیں، ''علی بن ابی طالب علیہ السلام پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلامی مذاہب کے درمیان تقریب کی بنیاد ڈالی ہے وہ جانتے تھے کہ خلافت کے لئے دوسروں کی نسبت زیادہ سزاوار ہیں، لیکن اس کے باوجود آپ نے ابوبکر، عمر اور عثمان کے ساتھ متواضعانہ برتاؤ کیا اور ان کی مدد کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی'' (مجلّہ رسالہ الاسلام، سال سوم، شمارہ ۴)

امام علی علیہ السلام نے اس وقت جس فتنہ کے خطرہ کا احساس کیا اور فکر مند ہوئے حضرتؑ کے ایک دوسرے بیان میں اس کی منظر کشی یوں کی گئی ہے۔ ''ابوسفیان جس نے اس سے پہلے ایک شخص کو مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے مامور کیا تھا) نے جوں ہی خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت اور لوگوں کے ذریعہ ابوبکر کی بیعت کرنے کی خبر سنی تو وہ مسلمانوں کے درمیان آکر یوں بولا: ''خدا کی قسم میں ایک ایسے شعلہ کو دیکھ رہا ہوں جسے خون کے علاوہ کوئی چیز بجھا نہیں سکتی ہے۔ کہاں ہیں عبد مناف! ابوبکر کو مسلمانوں کے امور کی ولایت سنبھالنے کا کیا حق ہے! پس علی و عباس کہاں ہیں؟ حکومت عبد مناف کی اولاد کے علاوہ کسی اور کو کیوں دی گئی؟''

(طبری ۱۳۵۷ھ، ج/۱ص/۱۳۳۱)

اس مکر وفریب اور مگر مچھ کے آنسو بہانے کے بعد، ابوسفیان۔ جو ایک لمحہ کے لئے بھی خدا ورسولؐ پر ایمان نہیں لایا تھا۔ نے یوں کہا: اے علیؑ! ہاتھ بڑھائیے تا کہ میں آپ کی بیعت کرلوں، خدا کی قسم اگر آپ چاہیں تو میں پیدل وسوار فوج کو ابوبکر کے خلاف جمع کر دوں گا'' امام علی علیہ السلام (اس کے ناپاک عزائم کو سمجھ گئے اور آپ نے) ہاتھ بڑھانے سے اجتناب کیا اور یوں فرمایا: ''خدا کی قسم تم فتنہ انگیزی کے علاوہ کچھ نہیں چاہتے ہو۔ بے شک تم پہلے سے ہی اسلام کے بدخواہ تھے اور ہمیں تمھاری نصیحت کی ضرورت نہیں ہے'' اس کے بعد ابوسفیان ناامید ہو گیا، وہ مایوسی کے عالم میں اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اپنے آپ سے چند اشعار گن گنا رہا تھا، جن کا مفہوم یہ تھا: میں نے ایک تیر پھینکا تھا تا کہ نشانہ پر لگ جائے لیکن وہ الٹا پڑا اور کسی نے اس کے لئے گریہ تک نہیں کیا'' (ایضا طبری....)

آج کل کے عالمی ظالموں اور سامراجی طاقتوں کے منافع کے لئے اسلام کا خطرہ عہد رسالت کی نسبت زیادہ ہے کیوں کہ آج مسلمان ممالک کے قدرتی ذخائر، دولت، آبادی اور ٹیکنالوجی پر دشمنوں کی للچائی نگاہیں پڑی ہیں اور ظلم کے خلاف اسلام کی پالیسی کی وجہ سے ان میں روز بروز حساسیت اور دشمنی بڑھتی جارہی ہے۔ ان کی نظر میں ان کے لئے کامیابی کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ براہ راست مقابلہ کرنے کے بجائے اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے عالم اسلام میں تفرقہ پھیلا کر اس کو اندر سے ہی کھوکھلا کر دیں اور زوال اور نابودی سے دوچار کریں۔

تقریب، اسلام کے دشمنوں کی ان سازشوں کو ناکام بنانے کے لئے کچھ پروگرام پیش کرتی ہے۔

۲۔ مسلمانوں کی عظمت کا تحفظ

دنیا کی موجودہ آبادی چھ ارب افراد پر مشتمل ہے۔ اس آبادی کا ایک چوتھائی حصہ مسلمان ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی یہ ڈیڑھ ارب آبادی گزشتہ پچاس سال کے دوران اسرائیل کی صرف تیس لاکھ آبادی کے مقابلے میں عالم اسلام کے جسم کے ایک حصہ یعنی مظلوم فلسطین کا دفاع نہیں کر سکی ہے۔ کیا اس کا سبب اس کے علاوہ اور کچھ ہے

کہ مسلمان اپنے اندر بے بنیاد اختلافات اور مختلف گروہوں اور فرقوں میں تقسیم ہونے کے نتیجہ میں اپنی عظمت و عزت کو مخدوش کر کے اپنے آپ کو ناتواں اور کمزور کر چکے ہیں؟ قرآن مجید فرماتا ہے: ﴿و اعدوا لهم ما استطعتم من قوه و من رباط الخيل ترهبون به عدو الله و عدو كم ﴾ کیا آج تک مسلمانوں کے مفکروں کا کوئی اجتماع تشکیل پایا ہے جو ان طعنہ زنیوں، نفرتوں، ایک دوسرے کو رد کرنے کے نتائج کے بارے میں غور کرے؟۔

کیا اس قضیہ سے واضح تر مثال پیش کی جا سکتی ہے کہ ایک مجموعہ کے آپس میں جدا اور پارہ پارہ ہونا دشمن کو طاقتور بنا کر فرصت اور موقع فراہم کرنے کا سبب بنتا ہے تا کہ وہ عظمت اسلام کو نابود کر دیں؟! کیا وجہ ہے کہ اس متمدن مجموعہ یعنی عالم اسلام میں خطرے کی گھنٹی دیر سے بج رہی ہے اور کئی بار ضرب کھانے کے باوجود مسلمان اس خطرہ سے بیدار نہیں ہوتے؟ آج مسلمانوں کے ضرب کھانے کے نقاط کو پہچاننا ایک ضروری امر ہے اور اس کے لئے ہوشیاری کی ضرورت ہے۔

یہودی چاہتے ہیں کہ اپنے افراد کو تمام دنیا سے جمع کر کے، حتی مسیحیت اور صہونیت کو بھی اپنے ساتھ ملا کر، اور عیسائیوں کے ساتھ اپنی دیرینہ اور بنیادی دشمنی کو فراموش کر کے اپنے اصلی دشمن، یعنی اسلام کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔

اسرائیل کے جوہری گودام میں تین سو ایٹم بمب کس لئے ذخیرہ کئے گئے ہیں؟ شارون نے مدتوں تک مخفی رکھنے کے بعد ۲۰۰۴ء کے اوائل میں جوہری سرگرمیوں کے بارے میں راز فاش کرتے ہوئے کہا: ''امریکہ، ایران کی طرف سے پیش آنے والے خطرات اور اسرائیل کی موجودیت کی مخالفت کرنے والے دوسرے ممالک سے مقابلہ کرنے کے لئے اسرائیل کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے اس کی حمایت کرتا ہے'' (سائٹ اطلاع رسانی فلسطین)

کیا یہ سزاوار ہے کہ مسلمان بھی دشمن کے ہم نوا بن کر، اسلامی معاشرہ کی شوکت وعظمت کو دھچکہ پہنچائیں اور اس زخم دیدہ پیکر کے متحد اعضاء کو ایک دوسرے سے جدا کریں؟ درخشاں برتری وعظمت صرف خود پرستی کو فراموش کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ تقریب کے عظیم استاد الازہر یونیورسٹی کے رئیس علامہ شیخ محمود شلتوت کہتے ہیں:

''مذاہب کو شیعہ وسنی میں تقسیم کرنا، صرف نام کی ایک اصطلاح ہے، ورنہ تمام مسلمان اہل سنت ہیں۔ کیوں کہ سب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اور آپؐ کے دستورات پر عمل کرنا واجب جانتے ہیں'' (بی آزار شیرازی ۱۳۷۷، ص ۳۵۲)

شمالی لبنان کے سنی قائد علامہ شیخ سعید شعبان کہتے ہیں:

''میں نہیں سمجھتا کہ ہم مسلمانوں کے مانند کبھی کسی قوم کے لوگ مشکلات سے دو چار ہوئے ہوں۔ باوجودیکہ حق ہمیشہ ثابت، پائدار اور واضح ہے، لیکن امریکہ نے ہمیشہ ملت مسلمہ سے کھیل کیا ہے۔ ہمارے دشمن ہمارے اختلافات کے دریچہ سے ہم میں نفوذ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں... میں کبھی اس بات کو نہیں بھول سکتا کہ میرے بچپن میں بیروت میں شیعہ اور سنی ایک ہی مسجد میں ایک ساتھ نماز پڑھتے تھے اور ان کے درمیان کوئی اختلاف رونما نہیں ہوتا تھا.... جی ہاں! ہماری نظر میں ایسا ہی اسلام دین واحد ہے۔ کیا آپ ضلالت کے شیخ کو پہچاننا چاہتے ہیں؟ جو مسلمانوں کے اختلافی نقاط کو شمار کرتا ہے، وہ ضلالت کا شیخ ہے اور جو ان کے درمیان اتحاد و اتفاق کا طریقہ کار سکھاتا ہے اسے ہدایت کا شیخ کہا جاتا ہے۔ کتاب جاء دور المجوس کی دوسری جلد میں لکھا گیا ہے کہ شیخ سعید شعبان شیعہ ہو گئے ہیں اور انھوں نے اپنی بہن اور بیٹی کی شادی شیعہ کے ساتھ کی ہے۔ اس مطلب کو اس کتاب کے مصنف نے بیان کیا ہے۔ لیکن میں اس وقت آپ سے کہتا ہوں کہ میں کبھی سنی نہیں تھا کہ شیعہ ہوتا، بلکہ میں اول سے ہی مسلمان تھا اور جانتا تھا کہ اسلام خدا کا دین ہے۔ ''ان الدین عند الله الاسلام '' '' و من يتبع غير

الاسلام دینا فلن یقبل منه ...''(ملحمہ الوحدۃ،ص/۱۷)

بہرحال،تقریب،مسلمانوں کی عظمت اور یکجہتی کی محافظ ہے اور دشمنوں کے دماغ سے مسلمانوں پر حملہ کرنے کی فکر کو دور کرتی ہے۔جس معاشرہ کے لوگوں میں اسلام کے علاوہ کوئی اور نشانی نہ ہو، وہ دشمنوں کے نفوذ کی گزرگاہوں کو بند کر دیتے ہیں تا کہ دشمن وہاں سے مسلمانوں کے متحدہ صفوف پر حملہ نہ کرسکیں،اس کے برعکس اگر وہ جزئی مسائل اور اختلافات کو ابھاریں تو دشمن کے حملہ کے لئے راستے کھل جاتے ہیں۔

۳۔دشمنان اسلام کی طمع کو ختم کرنا

اگر ہم اسلام کی حادثوں سے بھری تاریخ کی کتاب کی ورق گردانی کریں ،تو ہر جگہ پر درندہ صفت بھیڑیوں کے قدموں کے نشان پاتے ہیں جنھوں نے دین محمدیؐ کے پیروں پر خوں خوار حملے کئے ہیں۔مرحوم علامہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطا کہتے ہیں:

''آج مسلمانوں میں ہر بہرا اور گونگا شخص بھی آسانی کے ساتھ سمجھتا ہے کہ عالم اسلام کے ہر نقطہ پر، مغربی مگرمچھوں میں سے ایک مگرمچھ اور سامراجی اژدھاؤں میں سے ایک اژدھا منھ کھولے بیٹھا ہے تا کہ مسلمانوں کی سرزمین کے ایک ٹکڑے کو نگل لے۔کیا یہ خطرہ مسلمانوں کے متحد ہونے کے لئے کافی نہیں ہے تا کہ ان کے عزم و ارادہ اور غیرت کو شعلہ ور کرے؟ کیا یہ درد اور مصائب و آلام انھیں اتحاد و اتفاق برقرار کرنے اور آپسی رنجشوں اور کینہ کو فراموش کرنے پر مجبور نہیں کرسکتے؟ جب کہ کہا جاتا ہے کہ مصیبتوں میں کینے فراموش ہو جاتے ہیں''(حول الوحدہ الاسلامیہ،ص/۳۷)

مسلمانوں کی سرزمین قدرتی ذخائر اور ثروت سے سرشار ہونے کی وجہ سے ہمیشہ استعماری ظالموں کی طمع و لالچ کا نشانہ بنی رہی ہے۔دنیا کے تقریبا ستر فیصد تیل کے قدرتی ذخائر مشرق وسطیٰ میں پائے جاتے ہیں۔براعظم افریقہ کا ایک عظیم اور اہم علاقہ تمام ثروت و ذخائر کے ساتھ مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے اور یورپ اور امریکہ میں بھی

مسلمانوں کی آبادی قابل توجہ ہے۔صرف ایک چیز اسلامی ممالک پر قبضہ کئے ہوئے اور امن کے نام پر نا امنی پھیلانے والے مسلح ڈاکوؤں کی للچائی آنکھوں کو اندھا بنا سکتی ہے، اور وہ مسلمان قوموں کی یکجہتی ہے۔مسلمانوں کا آپسی اتحاد وہ اہم ترین ہتھیار ہے جو مسلمانوں کے خلاف دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بنا سکتا ہے۔

جی ہاں! انتہائی تعجب خیز بات ہے کہ،صدر اسلام کے مسلمانوں نے خالی ہاتھ، وقت کی دو بڑی سامراجی طاقتوں، یعنی ایران اور روم پر غلبہ پانے میں کامیابی حاصل کی ،لیکن آج اتنے وسائل کے باوجود ہر روز اسلامی ممالک کے ایک حصہ کو ظالم کاٹ کر لئے جاتے ہیں۔اسلامی ممالک کے بارے میں دشمنوں کی طمع و لالچ مندرجہ ذیل چار چیزوں میں خلاصہ ہوتی ہیں۔

الف)۔مسلمانوں میں ظلم کا مقابلہ کرنے اور استعمار کی مخالفت کرنے کا کھرا عقیدہ۔

ب)۔اسلامی ممالک کی مشرق و مغرب تک رسائی اور قدرتی منابع سے مالا مال ہونے کی وجہ سے حساس حیثیت۔

ج)۔دنیا کی آبادی کی قابل توجہ انسانی طاقت۔

د)۔مسلمان دانشوروں اور محققین کی سائینس اور ایجادات میں روز افزوں ترقی اور مسلمانوں کا متمدن ہونا۔

۴۔پیغمبر اتحاد سے قلبی لگاؤ:

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تمام مسلمان پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت رکھتے ہیں اور آپ کو اپنی اولاد اور ناموس سے بھی زیادہ دوست رکھتے ہیں۔آپؐ امت کے باپ، نبی رحمت اور سر تا پا رؤوف و مہربان تھے۔اگر ایک خاندان میں، فرزندوں اور خاندان کے دوسرے افراد کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے اور لڑائی جھگڑا کریں، تو بے شک خاندان کے سرپرست کے دل میں غم و ملال پیدا ہو گا اور وہ دل آزردہ ہوں گے۔کیا وہ وقت

نہیں آیا ہے کہ مسلمان آپس میں اتحاد واتفاق کر کے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خوشحال کردیں جو 'حریص علیکم ''(توبہ/۱۲۸) تھے اور اسلامی معاشرہ کی سربلندی کے لئے اتنی کوشش کرتے تھے کہ خداوند متعال نے فرمایا: ''طه ، ما انزلنا علیک القرآن لتشقی''(طہ/۱و۲)؟ یقیناً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اختلاف وافتراق سے راضی نہیں ہیں۔

مسلمانوں کے اتحاد کے بارے میں خداوند متعال فرماتا ہے: ''واعتموا بحبل الله جميعا و لا تفرقوا '' (آل عمران/۱۰۳) ''و اطيعوا الله و رسوله ولا تنازعوا فتفشلوا و تذهب ريحكم '' (انفال/۴۶) ''ولا تكونوا كالذين تفرقوا و اختلفوا من بعد ماجاء هم البينات و اولئک لهم عذاب عظيم''(آل عمران/۱۰۵)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

''ما اختلف امة بعد نبيها الا ظهر اهل با اطلها على اهل حقها''(ہندی، حدیث/۹۲۹)

نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''لا تختلفوا فان من كان قبلكم اختلفوا فهلكوا ''(ہندی، حدیث/۸۹۴)

اور امام علی علیہ السلام نے فرمایا ہے:

'' و الله لأ ظن ان هو لاء القوم سيد الون منكم باجتماعهم على باطلهم و تفرقكم عن حقكم''(نہج البلاغہ، خطبہ/۲۵)

بیشک آج اس بات کی ضرورت ہے کہ امت مسلمہ اپنے اندر موجود اختلافات سے چشم پوشی کر کے اتحاد و اتفاق کی حفاظت کرے اور اس مقصد کے لئے انجام دی گئی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محنتوں اور زحمتوں کی قدر کرے۔

قطر یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر محمد الدسوقی کہتے ہیں:

''فقہ کے حکم سے اسلامی اتحاد شرعاً واجب ہے اور یہ صرف ایک ترغیبی عمل نہیں ہے کہ اس کی طرف رضا کارانہ دعوت دی جائے بلکہ یہ کام ایک واجبی عمل ہے کہ خدا کی وحدانیت اور پیغمبر خدصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے معتقد ہر مسلمان کو اس کا پابند ہونا واجب ہے، یہ تمام مسلمانوں سے متعلق ہے اور قیامت کے دن اس کے بارے میں ان سے سوال کیا جائے گا۔ اسی لئے جو چیز اتحاد سے مربوط ہو وہ بھی واجب ہے۔ کیوں کہ جس چیز سے امر واجب وابستہ ہو، وہ ضروریات میں سے ہوتی ہے اور تقریب کی ذمہ داری دانشوروں پر ہے، کیوں کہ عام لوگ ان کے تابع ہوتے ہیں'' (علی دروب التقریب، ص/۵۹)

۵۔ اسلامی ممالک کی یونین کی تشکیل

شہید ڈاکٹر عبد العزیز رنتیسی ایک مقالہ میں، عالم اسلام کے درد اور مشکلات کو بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں:

''اسلام کے احیاء کے لئے ہمیں اسلامی ممالک کی یونین تشکیل دینی چاہئے'' وہ کہتے ہیں: ''اسلامی ممالک کے امور میں اجنبیوں خاص کر امریکہ کی مداخلت اس حد تک پہنچی ہوئی ہے کہ یہ جارح ملک عربی اور اسلامی ممالک کی سربراہی کانفرنسوں کے بیانیہ کے بارے میں اپنے نظریات پیش کرنے کو اپنا حق جانتا ہے۔ امت اسلامیہ کے دشمن کوشش کرتے ہیں کہ اسلامی ممالک کے درمیان اختلافات پیدا کئے جائیں۔ افغانستان اور عراق میں رونما ہونے والے حوادث اس امر کے شاہد ہیں۔ حتی فلسطین کی خود مختار تشکیلات کو فلسطین کی مقاومت خاص کر اسلامی مقاومت کی تحریک ''حماس'' کے خلاف اکسایا جاتا ہے۔ وہ راہ جس کی روشنی میں ہم مسلمانوں کی پراکندگی کو متحد کر سکیں، اسلامی ممالک کی یونین کی تشکیل ہے۔ اگر اس سلسلہ میں ایک رائے شماری انجام دی جائے، تو معلوم ہوگا کہ مسلمان اس سلسلہ میں متحد و موافق ہیں'' (سائٹ مرکز اطلاع رسانی فلسطین)

تقریب کی اسٹریٹجی

عام طور پر آج تک جن محققین نے تقریب کے موضوع پر قلم فرسائی کی ہے یا تقریریں کی ہیں، انھوں نے زیادہ تر اتحاد کے فضائل بیان کرنے اور یکجہتی کی ضرورت کے سلسلہ میں تاکید کرنے پر اکتفا کی ہے، لیکن کسی تعمیری نتیجہ تک نہیں پہنچے ہیں اور اتحاد کو عملی جامہ پہنانے کا کوئی منصوبہ پیش نہیں کیا ہے۔ ہم اسلامی اتحاد کے سلسلہ میں کی گئی کوششوں کی قدر دانی کرنے کے ضمن میں عصر حاضر کی اس فکری تحریک کے قائدین سے درخواست کرتے ہیں کہ اسٹریٹجی کو اتخاذ اور بیان کرنے کے بعد ایک عملی منصوبہ مرتب کریں انتظامی کمیٹیاں تشکیل دیں اور تقریب کے مقاصد تک پہنچنے کے لئے انھیں فعال کریں اور مذاکرات کے ساتھ ساتھ عملی اقدامات کو بھی آگے بڑھائیں۔

ہم نے نظری بحث میں تقریب کے مقاصد بیان کئے اور اس سے پہلے اسٹریٹجی اور تقریب کے معانی بیان کئے۔ اب ہم یہاں پر مذاہب اسلامی کی تقریب کے طریقہ کار کی سیاست (یا اسٹریٹجی) کو بیان کریں گے اور اس کے بعد اس طریقہ کار کے پیش نظر تقریب کے مقاصد تک پہنچنے کے منصوبوں پر عمل کے طریقوں کو تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔

ا۔ تشنج کو دور کرنا

اسلام کے دشمنوں نے آج تک کوشش کی ہے کہ آیت اللہ بلزیکی، شیخ حسن آلمانی اور شیخ یوسف فرانسوی جیسے نامعلوم اور جعلی شخصیتوں کے ذریعہ جذبات کو ابھار کر اور بظاہر تاریخ اسلام بیان کی جانے والی محفلوں کو منعقد کرنے کی داستانیں گڑھ کر مسلمانوں کے درمیان اختلافات کو ہوا دیں۔ ان کا مقصد مسلمانوں کے جذبات کو ایک دوسرے کے خلاف اکسانا ہے تا کہ اختلاف، افتراق اور لڑائی جھگڑے کا ماحول پیدا کریں اور اس لڑائی میں طرفین کی ہمت افزائی کر کے اپنا الو سیدھا کریں۔

دوسری طرف خلفائے راشدین نے ایک دوسرے کے نام اپنے بچوں پر رکھ کر آپس میں شادی بیاہ

کر کے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جس شخص سے اسلامی معاشرہ کو ادارہ کرنے کے سلسلہ میں اختلاف نظر رکھتے تھے، اس کی حمایت میں شرکت کر کے اختلافات کو دور کرتے تھے حالات کو معمول پر لانے کی کوشش کرتے تھے، اوراس کے بعد ائمہ اربعہ نے بھی اسی طریقہ کار اور سنت کی رعایت کی ہے اور یہاں تک کہ اس امام کے پیچھے بھی نماز پڑھتے تھے جس کے فتویٰ سے اختلاف نظر رکھتے تھے۔[1]

اگر چہ کتابوں میں لکھا گیا ہے کہ ''**سئل عن بعض الشافعية عن حكم الطعام الذی وقعت عليه قطرة نبيذ فقال يرمی لكلب او حنفی** ''لیکن قطعا، سوال وجواب کرنے والے شافعی وحنفی کے دشمن اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخالف تھے۔ یا اگر لکھا گیا ہے کہ ''**سئل عن حنفی هل يجوز للحنفی ان يتزوج المرأة الشافعية فقال ان ذلک لا يجوز لانها يشک فی ايها نها** ''یہ ساری چیزیں یا دوستوں کی جہالت کی وجہ سے یا دشمنوں کی شیطنت کی وجہ سے ہیں کہ معاشرہ کے ایک پیکر کو تکلیف اور اذیت پہنچانا پسند کرتے ہیں تا کہ ان پر ناامنی اور کشمکش مسلط کریں ورنہ آگاہ رہبر اور پرہیزگار اور وحی سنت کے قائل رہبر اور علماء کبھی ایسا کلام زبان پر نہیں لاتے ہیں اور ان کا اختلاف نظر لڑائی جھگڑا اور ایک دوسرے کی توہین کا سبب نہیں بنتا ہے

امامیہ بھی فقہائے اربعہ کو مجتہد جانتے ہیں جن سے صواب وخطا والے فتوؤں کا صادر ہونا ممکن ہے۔ اگر چہ وہ خود ان پر عمل نہیں کرتے ہیں لیکن انھیں قابل احترام جانتے ہیں۔

ا۔ جیسے امام ابوحنیفہ اوران کے ساتھیوں کا، جو بسم اللہ کے وجوب کے قائل نہیں تھے، امام مدینہ کے پیچھے نماز پڑھنا جو بسم اللہ کے وجوب کے قائل تھے اور ابو یوسف حنبلی مذہب کا رشید مالکی کے پیچھے نماز پڑھنا، جب کہ احمد بن حنبل مالک کے برخلاف خون نکالنا مبطل وضو جانتے ہیں اور رشید نے اس وقت حجامت کی تھی اور اسی کے بعد نماز کے لئے گھڑے ہوئے تھے اور یوسف نے ان کے پیچھے نماز پڑھی اور کہا کہ میں کیوں رشید کے پیچھے نماز نہ پڑھوں جب کہ شافعی نے ایک صبح کو ابوحنیفہ کی آرام گاہ کے نزدیک نماز پڑھی اوران کے احترام میں قنوت بجا نہیں لائے۔

الازہر یونیورسٹی کے قائدین میں سے ایک ڈاکٹر عبدالمجید سلیم کہتے ہیں کہ ''پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ و سلم کے اصحاب اور ان کے نیک پیروکار اور مذاہب کے ائمہ، کبھی کبھار آپس میں اختلاف رکھتے تھے وہ ایک دوسرے کے حجت اور دلیل کو رد کرتے تھے اور اپنی دلیل اور نظریہ کا دفاع کرتے تھے، لیکن آج تک ہم نے نہیں سنا کہ وہ ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے تھے اور ایک دوسرے پر تہمت لگاتے تھے۔ یہ اختلاف نظر کبھی آپسی دشمنی اور کینہ کا سبب نہیں بنتا تھا اور وہ کبھی اپنے نظریات کو، جن میں وہ اختلاف رکھتے تھے، اصول وشریعت کی بنیاد نہیں جانتے تھے کہ ان کا مخالف کافر یا گناہ کار ہو۔ وہ عقائد اور اصول دین میں نظری بحث اور اظہار رائے کا راستہ وسیع ہونے کی حمایت کرتے تھے اور فتنہ کو روکنے اور اتحاد کی حفاظت کے لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کی حمایت کرتے تھے تاکہ اپنی عزت، سعادت اور مقام ومنزلت کو اس کی روشنی میں بچاسکیں اور اس وجہ سے وہ ہمیشہ قوی اور آبرومند ہوتے تھے'' (مجلّہ رسالۃ الاسلام)

قطر یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر احمد عبدالرحیم السائح بھی تشنیع اور عیب جوئی کے بغیر اختلاف کے ممکن ہونے بلکہ ضروری ہونے کے بارے میں کہتے ہیں:

''مسلمانوں کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا ہے کہ آپس میں اختلاف نظر رکھیں، کیوں کہ اختلاف معاشرہ کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے، لیکن نقصان اس میں ہے کہ نظریاتی اختلاف ایک دوسرے سے جدائی اور دوری جس کی خداوند متعال نے قرآن مجید میں ذکر فرمایا ہے، کا سبب بنیں نہ اس معنی میں کہ اختلاف رائے ایک دستور ہو جس کا خدا نے حکم دیا ہو، بلکہ اس عنوان سے کہ اظہار نظر میں اختلاف ایک حقیقت ہے، لوگ مانیں یا نہ مانیں، اسلام میں مختلف مکاتب فکر کا ہونا فطری اور اچھی بات ہے بلکہ ناقابل انکار چیز ہے، جب تک اسلام زندہ اور زندوں کا دین ہو اور یہ اختلاف اس لئے ہو کہ دین کی زندگی کو بڑھاوا ملے اور جب تک مسلمان اپنی فکری میراث کو بیان کرنے اور اسے جاری رکھنے کے لئے مجبور ہوں تو اسلامی کلامی مذاہب اور مکاتب فکر کا وجود ضروری ہے۔ اور یہ

مسلمانوں کی مصلحت میں نہیں ہے کہ اسے کچل دیں کیوں کہ دین کی نسبت ایک مسلمان کی بہترین خدمت یہ ہے کہ اس کے بارے میں غور وفکر موجود ہو اور اگر اس میں تجسس اور غور وفکر ختم ہو جائے تو اسلام ضعف اور جمود کا شکار ہو جائے گا'' (علی دروب التقریب ص/٦٧)

جی ہاں غور وفکر میں یہ ظرفیت موجود ہے کہ اپنے اندر اختلافات کو قبول کرے اور اخلاص و دوستی کے علاوہ اس میں کچھ نہ ہو۔اس سلسلہ میں بہت سے تاریخی نمونے اور مطالب پائے جاتے ہیں۔

اب ہم تشنج کو دور کرنے کے طریقوں کی ایک فہرست پیش کرتے ہیں:

۱/۱۔ اسلامی فرقوں کے سرکردہ افراد کی طرف سے دوسرے فرقوں کے خلاف برا بھلا کہنے اور دشنام دینے کی ممانعت۔

قرآن مجید نے دشنام دینا حتیٰ کفر ونفاق کے سرداروں تک کو دشنام دینا منع کیا ہے اور فرماتا ہے:

''**ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدوا بغير علم**'' (انعام/۱۰۸)

امام علی علیہ السلام کو جب یہ اطلاع ملی کہ ان کے کچھ افراد اہل شام کو دشنام دیتے ہیں تو آپ نے انھیں فرمایا:

''**انی اکرہ لکم ان تکونوا سبابین و لکنکم لو وصفتم اعمالھم و ذکرتم حالھم کان اصوب فی القول و ابلغ فی العذر و قلتم مکان سبکم ایاھم اللھم احقن دماء نا و دمائھم**''

اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت میں نقل ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، نے حتیٰ شیطان کو بھی دشنام دینے سے منع کیا ہے اور فرمایا ہے کہ شیطان کو دشنام دینے کے بجائے'' **اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم**'' کہنا چاہئے'' (ہندی، کنزالعمال، حدیث/۲۱۲۰)

۱/۲۔ دوسرے فرقوں کے سربراہوں کی طرف سے اسلامی فرقوں پر تہمت لگانے کی ممانعت۔

سامراجی طاقتوں اور دشمنان اسلام کے حکم وسرمایہ سے، اسلامی فرقوں کو ایک دوسرے سے بدظن کرنے کی غرض سے بہت سی کتابیں شائع کی گئی ہیں جو تہمتوں اور افترا سے بھری ہوئی ہیں اور خوش قسمتی سے ان کے مقابل میں بعض مجاہدوں نے قلم کے جہاد سے بڑے فتنوں کو خاموش کرنے میں کلیدی رول ادا کیا ہے اور حقائق کو واضح کیا ہے۔اس قسم کے مجاہد اور حق کے متوالے محققین کی ہمت افزائی کی جانی چاہئے تا کہ وہ اپنے اس قلمی جہاد کو جاری رکھ سکیں۔سنی اور شیعوں کے درمیان اس قسم کے قلم کاروں کی کمی نہیں ہے جو مغلوب شدہ حقائق کو اپنے زور قلم سے حقیقت وانصاف کے روپ میں بدل سکتے ہیں۔

۱/۳۔عالم اسلام کے مفکروں کی طرف سے انتہا پسندی سے نفرت کا اعلان۔

جب کوئی آگاہ لیکن آلہ کار شخص یا ناآگاہ لیکن ہمدرد شخص اپنے قلم سے امت اسلامیہ کے پیکر پر کوئی زخم لگائے تو اسلامی مفکروں اور مختلف اسلامی گروہوں کو اس زخم کے مرہم کے لئے اقدام کرنا چاہئے اور اس زخم کو خراب ہونے سے بچانا چاہئے۔اسلام کے پیکر پر یہ زخم بارہا لگے ہیں اور بارہا انھیں کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔تقریباً ۴۶ سال قبل، یعنی ۱۳۸۰ھ میں جب مجلّہ ''رایۃ الاسلام'' طبع ریاض نے علامہ شیخ محمود شلتوت کے نام ابراہیم الجبہان کا خط شائع کیا تھا اور اس میں شیعہ عقائد اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی توہین کی گئی تھی، تو آیت اللہ شیخ عبدالکریم زنجانی نے امیر کویت شیخ عبداللہ سالم الصباح، کے نام ایک خط لکھا اور اس سے تقاضا کیا تھا کہ نجف اشرف خاص کر حرم امیر المومنین علیہ السلام میں موجود قرآن مجید کے نسخوں اور بالاخص حرم کے خزینہ قرآن مجید میں موجود حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ سے لکھے ہوئے قرآن مجید کا مشاہدہ کر کے شیعوں پر قرآن مجید میں تحریف کی تہمت یا شیعوں کے پاس موجودہ قرآن کے علاوہ کسی اور قرآن کے وجود کی نفی کر کے شیعوں کے اعتقادات کے خلاف مولف کی دوسری تہمتوں کا ازالہ کریں۔دس دن کے بعد امیر کویت نے اس خط کے جواب میں یوں لکھا: ''مجلّہ رایۃ الاسلام'' کے بارے میں، ۱۳۸۰/۵/۱۵ھ کو بھیجا ہوا آپ کا ٹیلیگراف ملا۔اس مجلّہ میں آپ کے شکوہ کے مورد نظر شخص (ابراہیم

الجیہان) نے ہمارے دینی بھائیوں کے عقائد پر حملہ کیا ہے اور ہم اس جاہل مفسد کے عمل کی مذمت کرتے ہیں اور جو کچھ آپ جانتے ہیں اس کی تاکید کرنا چاہتے ہیں کہ ہم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کا احترام کرتے ہیں ان کی محبت کے سلسلہ میں آپ کے ساتھ ہیں ۔اس کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ اس کے (ابراہیم الجیہان) اس کام نے آپ کی طرح ہمارے جذبات کو بھی مجروح کیا ہے، کیوں کہ ہم دین کے معاملہ میں متحد ہیں اور اس جاہل کا کام اس میں کسی قسم کا رخنہ نہیں ڈال سکتا ہے۔ جوں ہی اس کے اس کام کی خبر ہمیں ملی، ہم نے اسے کویت سے ملک بدر کیا اور ہم سب امید رکھتے ہیں کہ یہ کام پھر سے تکرار نہ ہو۔آخر میں فرصت کو غنیمت سمجھتے ہوئے اپنی بہترین تمناؤں اور زیبا ترین تحیات کو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور جناب عالی کی دینی خدمات میں کامیابی کی دعا کرتا ہوں ۔خداوند متعال آپ کے سایہ کو برقرار اور آپ کو محفوظ رکھے'' (ثابت)

۱/۴۔اختلافی نقاط میں سے موافق تعبیروں کا پیش کرنا۔

فطری بات ہے کہ اسلامی فرقوں، خاص کر شیعہ و سنی کے درمیان کچھ اختلافات ہیں،لیکن اختلافی نقاط سے مورد اتفاق زاویوں کو ابھارنا چاہئے تا کہ لڑائی جھگڑے کو روکا جا سکے اور اتحاد و اتفاق کی حافظت کی جائے۔سید مرتضٰی کہتے ہیں:''تقریباً پانچ سو زیدی مسجد کوفہ میں شیخ مفید کے گرد جمع ہوئے تھے، زیدیوں میں سے ایک شخص، جو فتنہ ایجاد کرنا اور شیعوں اور زیدیوں کے درمیان اختلاف پیدا کرنا چاہتا تھا، نے شیخ مفید سے مخاطب ہو کر کہا: آپ زید بن علی کی امامت کے بارے میں کیسے توجیہ کر سکتے ہیں؟! شیخ نے فرمایا:تم میرے بارے میں غلط فہمی سے دو چار ہوئے ہو! کہ میں زید کے بارے میں عقیدہ رکھتا ہوں، اس کا زیدیوں میں سے کوئی مخالف نہیں ہے۔اس شخص نے پوچھا: زید بن علی کی امامت کے بارے میں آپ کا عقیدہ کیا ہے؟ شیخ نے فرمایا: میں زید کی امامت کے بارے میں وہی چیز قبول کرتا ہوں جسے زیدیہ قبول کرتے ہیں اور جسے وہ مسترد کرتے ہیں اسے میں بھی مسترد کرتا ہوں۔پس میں کہتا ہوں کہ زید،علم وتقویٰ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں پیشوا تھے اور جس امامت کے کے لئے نص اور معجزہ

کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان کے پاس نہیں تھی اور یہ وہ چیز ہے جس میں زیدیوں میں سے کوئی بھی شخص مجھ سے اختلاف نہیں رکھتا ہے۔اس مجلس میں موجود تمام زیدیوں نے شیخ کا شکریہ ادا کیا اور فتنہ وفساد برپا کرنے والے شخص کی شیطنت ناکام ہوئی'' (آذرشب،۱۳۷۹،۲۵)

۱/۵۔افراد کے ذاتی نظریات کو مکاتب فکر کے نظریات سے جدا کرنا۔

تمام مذاہب میں ایسے افراد اور روایتیں موجود ہیں کہ اگر بہانہ تراشی کے نقطہ نظر سے ان کو جانچا جائے تو اتفاق واتحاد اور تقریب کی بنیادوں کو متزلزل کیا جا سکتا ہے۔لیکن یہ نظریات کسی مکتب کے نصب العین اور اس مکتب سے تعلق رکھنے والے تمام افراد کے نظریات کی عکاسی نہیں کر سکتے لہٰذا جس طرح شیعہ اور سنی دونوں فرقوں کے دانشوروں کے بیانات میں آیا ہے، ایک شخص کا نظریہ کتنا ہی اہم ہو، وہ اس کا ذاتی نظریہ ہے اور فیصلہ کرنے کا معیار اکثریت کا نظریہ ہوتا ہے۔اختلافی مواقع پر معمولاً معقول اور درمیانی بات مانی جاتی ہے۔

۱/۶۔فیصلہ کرنے کے میدان سے انتہا پسند افراد کو دور کرنا۔

تشنج اور اختلافات کو دور کرنے کے سلسلہ میں طالبانزم کے انتہا پسند موقف اور لوگوں کی جان ومال کے حلال کئے جانے کے فتوے زبردست نقصان دہ ہو سکتے ہیں۔فیصلہ کے مراحل اور مقامات پر اس قسم کے افراد کا وجود ،مسلمانوں کی بنیادوں کو نابود کرنے کے لئے دسیوں مسلح لشکر سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔اس لحاظ سے سزوار ہے کہ ایسے افراد کو دور رکھنے کے لئے یا ان کی سرگرمیوں کو محدود کرنے کے لئے مختلف طریقوں لابیوں اور منطقی صلاح و مشوروں سے استفادہ کیا جائے۔

۲۔توانائی کو بڑھاوادینا

اسلامی معاشرہ ایک طاقتور معاشرہ ہونا چاہئے۔اسلامی معاشرہ کا طاقتور ہونا، دشمنوں کو آپس میں مشغول کرتا ہے اور خود اپنے معاشرہ کے اندر موجود افراد کو تعمیر وترقی،علم وثروت اور ایجادات کو بڑھاوادینے پر مجبور کرتا ہے

۔اکثر فضول اور بے بنیاد لڑائیاں اسلامی ممالک کی علمی کمزوری، جمود اور اقتصادی ناتوانیوں کا نتیجہ ہیں جو دوسروں کے دام میں پھنس جانے کا سبب بن جاتی ہیں جب کہ دنیا بڑی تیزی سے نئی نئی ایجادات اور علمی کمال کی فکر میں ہے ۔ یہاں تک کہ دنیا والے اپنے علمی فریضے اور فلسفی اعتقادات میں روز افزوں تبدیلیاں لا رہے ہیں اور قرون وسطی کے طرز تفکر کو عقلانی ریشنلزم اور پھر تجرباتی رجحان اور مثبت رجحان، پھر پوسٹ ماڈرن لزم کی طرف بڑھ رہے ہیں، ان حالات میں کیا وجہ ہے کہ ہم ''ارجلکم'' کے لام کے کسرہ وفتحہ کے اختلاف کی بحث میں الجھے رہیں؟!

تقریب کا سیاسی طریقہ کار، اسلامی معاشرہ کی توانائی کو بڑھاوا دینا ہے اسلامی نظام کے رہبر معظم حضرت آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای مدظلہ العالی نے بھی مختلف طریقوں سے اپنے پیغامات اور راہنمائیوں میں اس امر کی طرف تاکید اور اشارہ کیا ہے اس سلسلہ میں مجوزہ عملی طریقے حسب ذیل ہیں:

۲/۱۔ بین الاقوامی اور بین المذاہب یونیورسٹیوں کی تشکیل۔

۲/۲۔ جواہری ٹیکنالوجی، نانوٹیکنالوجی اور بایوٹیکنالوجی کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔

۲/۳۔ اسلامی ممالک کے درمیان اقتصادی روابط کو وسعت بخشنا اور آپس میں مبادلہ ممکن ہونے کی صورت میں غیر اسلامی ممالک کے ساتھ معاملات انجام دینے سے انجام دینا۔

۲/۴۔ کئی ملکوں پر مشتمل اقتصادی آرگنائزیشن کی تشکیل۔

۳۔ معلومات میں اضافہ

ذرائع ابلاغ کے اس دھماکہ خیز زمانے میں طاقت کا سب سے اہم عامل اطلاعات کے وسائل ہیں جارج بوش (باپ) اپنی صدارت کے آخر میں کہتا ہے: ''میں امریکہ کے صدر جمہوریہ کے عنوان سے آپ کو اطمینان دلا سکتا ہوں کہ (لوگوں کے فون) سننے کی کاروائی بین الاقوامی سطح پر فیصلے لینے کا ایک اہم فیکٹر ہے'' (مجلّہ سیاحت غرب ۴، ص ۴۴ نقل از مجلّہ کانفیڈنسل ڈیفینس، جولائی ۲۰۰۰ء) اسی طرح اسرائیل نے ۱۹۹۴ء میں اعلان کیا کہ اس

ملک کا ۴۰ فیصد بجٹ ثقافتی کاموں کے لئے ہے اور یہ رقم صلح کے زمانے میں بڑھ جائے گی۔

ثقافتی وسائل، ذرائع ابلاغ اور تبلیغات سے استفادہ کرنا، معاشرہ کی کامیابی میں کلیدی رول ادا کرسکتے ہیں۔ تقریب کا اہم اور حساس پروجیکٹ ٹیکنالوجی (IT) سے استفادہ کئے بغیر مطلوبہ مقصد حاصل نہیں کرسکتا ہے۔ مسلمانوں کے فرقوں کے حدود میں اور اس سے باہر عالم اسلام کی اطلاعاتی اور تبلیغاتی آرایش ونظم، تقریب کے گاڑی کو صحیح سمت و مقصد تک پہنچانے میں کلیدی رول ادا کرسکتے ہیں اس سلسلہ میں مجوزہ طریقہ کار حسب ذیل ہیں:

۳/۱۔ اسلامی فرقوں کی ایک دوسرے کی معلومات میں کتابوں، مقالات اور مجلّات اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے افزائش۔

۳/۲۔ مسلمانوں کو دشمنوں کے حالات اور ان کے پس پردہ منصوبوں، جیسے عظیم مشرق وسطیٰ جہانی سازی اور NPT جیسے معاہدات سے آگاہ کرنا۔

۳/۳۔ حج کی عظیم کانفرنس سے استفادہ کرنا۔

۳/۴۔ مختلف ممالک اور مذاہب کے علماء، دانشوروں اور محققین کے درمیان روابط کو آسان بنانا تاکہ ایک دوسرے سے ملاقات کرسکیں۔

۳/۵۔ مسلمان اقوام کے لئے واحد نصب العین اور منشور شائع کرنا۔

۳/۶۔ ہر مذہب سے مربوط اصلی کتابوں کو نئے سرے سے لکھنا اور انھیں ان مطالب سے پاک کرنا، جو اسلامی مذاہب کی تقریب کے لئے نقصان دہ ہوں۔

۳/۷۔ فکری قانونی اور حقوقی ماحول فراہم کرنا اور اسلامی ممالک کی ایک یونین تشکیل دینا۔

۳/۸۔ بین الاقوامی معاشروں میں مسلمانوں کی علمی اور قانونی طور پر سرگرم شرکت۔

۳/۹۔ ایران، لبنان، مصر، عراق اور دیگر ممالک میں اسلامی مذاہب کے تقریبی حلقوں کو متصل کرنا اور

مذاہب اسلامی کی تقریب کی کنفیڈریشن تشکیل دینا۔

آخری بات

آخر میں، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی اور مخلص پیروں کے عنوان سے تقریب کے تمام منادیوں کی کامیابی کی آرزو کرتے ہوئے اس مقدس نظریہ کے مخالفین سے نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ زمان ومکان کے حالات کو درک کریں۔ سرحدوں کے کھلنے اور حالات بدلنے کے پیش نظر آج جو باطل افراد بدظنی اور دشمنی پھیلاتے ہیں، وہ ننگے ہو چکے ہیں اور یہ لوگ صرف اسلامی فرقوں میں موجود جاہل اور تنگ نظر افراد ہیں جو اتحاد و اتفاق کے دشمنوں سے ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ آج حجاز کے مرکز میں شیعوں کی کتابوں کا کافی تعداد میں تبادلہ ہوتا ہے اور یہ کتابیں کتابوں کی بین الاقوامی نمائشگاہ میں باقاعدہ طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ جہاں پر ایک دن شیعوں کے خلاف جھوٹ اور تہمت باندھنے کا مرکز تھا اسی طرح شیعوں کے مرکز یعنی ہم میں اہل سنت کی کتابیں بھری ہوئی ہیں

آیئے ! ہم اپنے آپ کو جاہلوں کی صف سے جدا کر کے مستقبل قریب میں دنیا بھر میں چھا جانے والے دین، پر یقین کر کے اپنے پروگرام مرتب کریں، جس کے پھیلاؤ کے احتمال سے دشمن پریشان ہیں۔ اس دن کی امید کے ساتھ، جب کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا پرچم پوری دنیا میں سربلند ہوگا۔

منابع و مآخذ

۱۔ آذرشب، محمد علی، ملف التقریب، تہران، المجمع العالمی للتقریب بین المذاہب الاسلامیۃ، ۱۳۷۹ش

۲۔ آقا بخشی، علی وافشاری، مینو، فرہنگ علوم سیاسی، نشر چاپار۔

۳۔ ابن ابی الحدید، عبدالحمید بن ہبۃ اللہ، شرح نہج البلاغہ، بہ تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم، بیروت، دار الاحیاء التراث العربی، چاپ دوم، ۱۳۸۵ق، ج ۶

۴۔ بی آزار شیرازی، عبدالکریم، ہمبستگی مذاہب اسلامی، تہران، سازمان فرہنگ وارتباطات اسلامی،

۱۳۷۷ش۔

۵۔ثابت،محمد سعید،الوحدۃ الاسلامیہ،مطبعۃ الغری الحدیثۃ، نجف۔

۶۔ثقفی،ابراہیم بن محمد،الغارات،عطارد،۱۳۷۳،ج۱/۔

۷۔حول الوحدۃ الاسلامیہ،منظمۃ الاعلام الاسلامی، چاپ اول،۱۴۰۴ق

۸۔رسالۃ الاسلام،سال سوم،شمارہ چہارم۔

۹۔سایت مرکز اطلاع رسانی فلسطین۔

۱۰۔طبری،محمد بن جریر،تاریخ طبری،قاہرہ،مطبعۃ الاستقامۃ،۱۳۵۷ق۔

۱۱۔علامہ مجلسی،بحارالانوار،ج ۳۳/۔

۱۲۔علی دروب التقریب،دارالتقریب بین المذاہب الاسلامیہ، بیروت۔

۱۳۔قمی،محمد تقی،منادیان تقریب۔

۱۴۔مجلّہ سیاحت غرب،مرکز پژوہش ھای صداو سیمای جمہوری اسلامی ایران،شمارہ ۴۔

۱۵۔مجلّہ حوزہ،دفتر تبلیغات اسلامی،شمارہ ۴۴/۴۳۔

۱۶۔مجلّہ رسالۃ الاسلام،شمارہ ا سال اول، ربیع الاول ۱۳۶۸ق

۱۷۔ملحمہ الوحدۃ

۱۸۔نہج البلاغہ

۱۹۔ ہندی،علاء الدین علی التقی بن حسام الدین، کنزالعمال۔

اسلامی اتحاد کے لئے امام علیؑ کا خلفاء سے تعاون

اسماعیل دانش

سید نوشاد علی نقوی

خلاصہ:

اسلامی امت کے اتحاد کی ضرورت واہمیت کسی پر مخفی نہیں ہے قرآن کریم وپیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سنت کے علاوہ ائمہ معصوم علیہم السلام کے اقوال وسیرتیں اسلامی اتحاد کے لئے طراوت آفرین روح بخش ہیں۔

اس مقالہ میں اس موضوع کی ضرورت ومقصد نیز مفہوم اتحاد کی شناخت کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہےاوراس سلسلہ میں امام علی علیہ السلام کا اسلامی اتحاد کے لئے خلفاء سے تعاون اور آپ کا اسلام کی طول تاریخ میں اتحاد کا محافظ و پاسبان ہونے کو ثابت کیا گیا ہے۔آپ کے سیاسی، اقتصادی، عسکری مشورے، علمی وقضاوتی مساعدت ودیوانی امور میں لازمی راہنمائی وہدایت جیسے موارد ومواقع خلیفہ اول کے ساتھ تعاون کے طور پر شمار کئے گئے ہیں اسی طرح خلیفہ دوم کے عصر میں مذکورہ مسائل کے علاوہ جنگ جسر وروم اور بیت المقدس کے لئے عسکری مشورہ نیز آپ کے پیرو حضرات کا جنگ اور

حکومتی مسائل میں شرکت کو اسلامی اتحاد کا عنوان دیا گیا ہے۔ آپ کی یہ مساعدت و ہدایت خلیفہ سوم کے زمانہ میں بھی جاری رہی لیکن اس عصر کے خاص مسائل میں آپ کا اقدام اس تعاون کو مزید آشکار کرتا ہے۔ جیسے خلیفہ سوم اور ان سے ناراض گروہ کے درمیان وساطت ولیا نجگیری، خلیفہ کا گھر محاصرہ ہونے کے عالم میں اسے فرزند امام حسن و حسین کے ذریعہ متک آپ کا بھیجنا... آپ کے یہ افعال و رفتار اسلامی اتحاد کی عظمت و فوقیت کو اجاگر کرتے ہیں، عصر حاضر میں بھی اسلامی امت، اتحاد و وحدت کی شدید نیاز مند ہے، امام علی علیہ السلام کے یہ اقدامات اسلام کے مصالح اور اسلامی امت کے اتحاد و پایداری کے لئے، کامل اہتمام کو نمایاں کرتے ہیں۔

کلیدی الفاظ: تعاون ، خلفاء ، اسلامی اتحاد ، اتحاد ، سیاسی مشورت ، عسکری مشورت ، قضاوتی مساعدت، عدلیہ کے امور، وساطت۔

اہل اسلام کا اتحاد بہت اہم اور اساسی مسئلہ ہے جس کے لئے قرآن اور پیغمبر اکرمؐ کی سنت بہت تاکید کرتی ہے، اتحاد کی روح بخش صدا اس وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے باوفا اصحاب کی زبان پر جاری ہوئی جب زمان جاہلیت کے آداب ورسوم اور کینہ دیرینہ کی بناء پر تفرقہ کا زمزمہ کانوں سے ٹکرا رہا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کی رحلت، قومی ونسلی برتری کی واپسی کے لئے مناسب موقع فراہم کر رہی تھی، مسلمانوں کے درمیان آپ کی جانشینی کے مسئلہ پر پہلا شگاف ظاہر ہوا۔ ہر گروہ اس مسئلہ میں انواع واقسام کی دلیلیں لاتا تھا، واقعہ سقیفہ اور خلیفہ اول کے معین ہو جانے کے بعد پیغمبر اکرمؐ کے اکثر احباب اختلاف نظر واختلاف سلیقہ کے باوجود مصالح اسلام اور اسلامی امت کے اتحاد کے لئے سکوت اختیار کئے رہے تاکہ اسلامی معاشرہ تفرقہ وانتشار کا شکار نہ ہو۔

حضرت امام علی علیہ السلام مسلمانوں کے اتحاد کی خاطر اپنے اصحاب کو ہر قسم کی ایسی حرکت سے جو اہل

اسلام کی تضعیف وتفریق کا سبب ہومنع فرماتے تھے۔آپ نے ہر حال میں خلفاء کی علمی وفکری مساعدت افرمائی ہے تاریخی واقعات شاہد ہیں کہ اہم امور میں علی علیہ السلام سے خلفاء کے مشورے سبب بنے کہ مرکز خلافت اصولی خطاو لغزش کا شکار نہ ہو۔خصوصا قضاوتی امور میں مشوروں میں عوام کے حقوق پائمال ہونے سے محفوظ ہوئے۔

موضوع کی ضرورت

آج جب کہ عالمی استکبار پوری توانائی سے عالم اسلام کونشانہ پر لئے ہوئے ہےاور بعض اسلامی ممالک کو تسخیر کر کے انھیں اس نے اپنی جولان گاہ بنا رکھا ہے،اسلامی امت کے اتحاد کی ضرورت زیادہ سے زیادہ آشکار ہو رہی ہے۔حال حاضر کی مشکلات سے مقابلے کا واحد راستہ صاحبان اسلام کا اتحاد ہے۔

قرآن اور اہل بیت اطہار علیہم السلام کی احادیث بھی امت اسلامی کی اتحاد کو ایک لازمی امر قرار دیتے ہوئے اس کے لئے شدید تاکید کرتی ہیں ’’واعتصموا بحبل الله جميعا و لا تفرقوا ‘‘۔اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور آپس میں تفرقہ نہ پیدا کرو۔آل عمران ر۱۰۳

حضرت امام صادق علیہ السلام کی نظر میں مسلمان جماعت سے ایک بالشت کا فاصلہ بھی اختیار کرنا اپنی گردن سے اسلام کے رشتہ کو الگ کرنے کے مترادف ہے (کلینی ،کافی ،ج ۱ر ص ر۴۰۵) لہٰذا عالم اسلام کا اتحاد و عدم تفرقہ ،اول عقلی ضرورت ہے،دوم بہت سی آیات اور اہل بیت اطہارؑ کی احادیث نے اسے ایک ضرور اصل قرار دیا ہے۔

مقصد:

پیش نظر بحث کا اصل مقصد امت اسلام اور اسلامی مذاہب کے پیروؤں کے مابین اتحاد قائم کرنا ہے جو امام علی علیہ السلام کی سیرت نیز خلفاء سے آپ کے برتاؤ اور ان کی مختلف مساعدتوں پر توجہ کرتے ہوئے امکان پزیر ہے

مفہوم شناسی:

مختلف علمی اور سماجی مسائل میں جاری بحث کلمات اور مفاہیم کی تبیین ہے جو اس بحث میں استعمال ہوتے ہیں لہٰذا لازم ہے کہ بعض کلمات کی تعریف کی جائے۔

۱۔ وحدت اور اتحاد

الف)۔ لغوی معنی: لغت میں وحدت کے معنیٰ ایک ہونا، ایک رہنا ایک مقصد و مذہب میں ایک گروہ کا اشتراک، مجموعی مقاصد و آمال میں تمام افراد قوم کا اشتراک (معین، ج۴، ص ۴۹۸۹)

اتحاد: لغت میں اتحاد کے معنی، ایک ہو جانا (طریحی، ج۴، ص ۴۷۶) ایک کرنا، ایک رنگ، ایک دل، ایک جہت، ہم مقصد۔

۲۔ اصطلاحی معنی

اصطلاح میں وحدت و اتحاد سے مراد یہ ہے کہ چند چیز اپنی ذاتی خاصیت کو محفوظ رکھتے ہوئے آپس میں ایک ہو جائیں۔ (سعید بند علی، ص ۱۴) لہٰذا اسلامی امت کی وحدت و اتحاد کا مفہوم تمام مسلمانوں کا اپنی مذہبی ہویت کو محفوظ رکھتے ہوئے، مشترک دشمن کے مقابل متحد و ہم مقصد ہونا ہے۔ ائمہ معصومین علیہم السلام بھی جو خداوند عالم کی طرف سے امت اسلامی پر منصوص و منصوب حاکم تھے، اتحاد کی حفاظت کے لئے اپنے عصر کے حکام سے ارتباط اور تعاون فرماتے تھے۔

ب)۔ تعاون

تعاون کے معنی، مدد کرنا، لوگوں کا آپس میں کمک و مدد کرنا (خلیل سید حمید طبیبیان، ج۱، ص ۵۹۵) اس معنی کی روشنی میں تعاون دو طرفہ ہے لہٰذا دو فرد کا ہونا ضروری ہے ورنہ تعاون برقرار نہیں ہو سکتا ہے البتہ تعاون کی قلمرو اور وسعت مادی اشیاء کی مدد و کمک میں منحصر نہیں ہے اور فکری و عملی مساعدت کو بھی شامل ہے۔

مصالح کے پاسبان:

پیغمبر اکرمؐ کے زمانۂ حیات میں نوخیز اسلامی معاشرہ ہر وقت، ایران روم اور منافقین کی جانب سے تہدید کا شکار تھا، رومی شہنشاہیت کا خطرہ ہمیشہ پیغمبرؐ کی فکر کو مشغول کئے رہتا تھا۔حتی آپ اپنی رحلت تک اسی فکر میں تھے۔ رومی فوج سے مسلمانوں کا پہلا عسکری مقابلہ جو ہجرت کے آٹھویں سال سرزمین فلسطین پر ہوا تھا اسلامی فوج کی شکست پر تمام ہوا لہٰذا مرکز اسلام پر ہمیشہ حملہ کا خطرہ منڈلاتا رہتا تھا۔

پیغمبر اکرمؐ نے ہجرت کے نویں سال ایک منظّم و مسلح فوج کے ہمراہ شام کی طرف روانہ ہوئے اور آخر کار اپنی دیرینہ حیثیت وعظمت کو حاصل کر لیا (ابن ہشام، ج ۴،ص ۱۱۲۸، طبری ج ۳،ص ۴۲ و ۳۶) لیکن رسول اعظمؐ اس کامیابی سے مطمئن نہ تھے لہٰذا اپنی بیماری سے چند روز قبل اسلامی فوج کو اسامہ کی قیادت میں شام کی طرف جانے کا حکم دیا۔(ابن ہشام، ج ۴،ص ۲۸۸، علی بن اثیر، ج ۲،ص ۵، طبری، ج ۳،ص ۱۸۳۔ اسلامی مرکز کے لئے دوسرا خطرہ شہنشاہ ایران کی جانب سے تھا ایران کا خسرو شاہ پیغمبر گرامیؐ کی دعوت اسلام کے بعد شدید ناراض ہوا۔اس نے آپ کے نامہ کو پھاڑ دیا اور اسلامی سفیر کے ساتھ توہین آمیز سلوک کیا اور یمن کے حاکم کو خط لکھا کہ پیغمبر اکرمؐ کو قید کرے اور امتناع کی صورت میں قتل کر دے۔(محمد بن سعد ج ۱،ص ۲۶۰، مجلسی، ج ۲۰،ص ۳۸۹) لیکن خسرو پرویز کی عمر زیادہ دن کی نہ تھی وہ پیغمبر اکرمؐ کی حیات ہی میں قتل کر دیا گیا۔تیسرا خطرہ، منافق کی جانب سے تھا ان کے افراد مکر رستون پنجم کی مانند مسلمانوں کے درمیان تخریب میں مشغول تھے۔حتیٰ انھوں نے تبوک سے مدینہ واپسی کی راہ میں رسول اکرمؐ کو قتل کرنے کا پروگرام بھی مرتب کیا تھا۔منافقین کی تخریبی طاقت اس قدر خطرناک تھی کہ قرآن کریم نے ان کا ذکر بقرہ، آل عمران، نساء مائدہ، انفال، توبہ، عنکبوت، احزاب، محمد، فتح، مجادلہ، حدید، منافقون، حشر سوروں میں کیا ہے (آیۃ اللہ سبحانی، مبانی حکومت اسلامی، ص ۱۳۰) پیغمبر اکرمؐ کی غم انگیز رحلت کے بعد اسلامی امت، رہبری وخلافت کے مسئلہ پر شدید اختلاف سے دوچار ہوئی، شیعوں کا عقیدہ یہ تھا کہ رسول اکرمؐ

نے اکثر مواقع خصوصاً غدیر خم میں علی علیہ السلام کو اپنا جانشین قرار دیا ہے لیکن اہل سنت کا نظریہ یہ تھا کہ آپ نے ایسے منصب کے لئے کسی خاص فرد کا انتخاب نہیں کیا ہے۔

بہر حال سقیفہ میں بعض افراد نے بڑی بحث و گفتگو کے بعد آخر کار مسلمانوں کے لئے ایک خلیفہ کا انتخاب کیا۔ حالانکہ رسول اکرمؐ کے قریبی اشخاص اور اچھے خاصے اصحاب حاضر نہ تھے۔[۱] اس واقعہ کے بعد مسلمانوں کے درمیان کشمکش اوج پکڑنے لگی اور اس حالت میں اسلام ہر وقت اندرونی و بیرونی دشمنوں کی جانب سے تہدید کا شکار ہو رہا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام جو اس مسئلہ میں خود کو صاحب حق جانتے تھے اسلامی امت کے مصالح کی حفاظت کی خاطر اپنے مسلم حق سے دستبردار ہو گئے اور موجودہ حالات کے مقابل سکوت اختیار کیا۔ اگر حضرت علی علیہ السلام قدرت وطاقت سے کام لے کر اپنے حق کو حاصل کرنے کے لئے اقدام فرماتے تو ذیل کے نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔

۱۔ امام علی علیہ السلام کے مسلحانہ قیام میں آپ کے اچھے خاصے اصحاب جو دل و جان سے آپ کی امامت کے قائل تھے، شہید کر دیئے جاتے، اللہ کی رہ میں جانفشانی وشہادت پسندیدہ امر ہے لیکن ان افراد کی شہادت کے باجود حق، حقدار تک نہیں پہنچتا۔

۲۔ آپ کے بہترین اصحاب وعزیز کی شہادت کے علاوہ بنی ہاشم اور آپ کے اصحاب کے قیام کے سبب پیامبر اکرم کے بہت اصحاب بھی جو آپ کی خلافت کے مخالف تھے قتل کئے جاتے جس کے نتیجہ میں مرکز میں اسلامی قدرت تضعیف ہوتی، یہ جماعت اگر چہ رہبری و قیادت کے مسئلہ میں امام علی علیہ السلام کے مقابل تھے لیکن دوسرے امور میں امام علیہ السلام کے مخالف نہ تھے یہودیت، مسیحیت و شرک کے مقابل ایک طاقت شمار ہوتے تھے۔

۱۔ ابوذر، سلمان مقداد، عمار، ابوایوب انصاری، عباس عمو پیمبرؐ، فروہ ابن عمرو، ابی ابن کعب، براء ابن عازب، ابوالھیثم ابن التیھان، خالد بن سعید و بریدہ اسلمی، خزیہ ابن ثابت و۔۔۔ نے بیعت نہیں کیا۔ (ابن عبدربہ، العقد الفرید، ج۴ص۲۴۱)

۳۔ مسلمانوں کی ناتوانی وضعف کی بناء پر، دور افتادہ قبائل جن کی فکر اسلام بطور کامل رسوخ نہ کئے تھا وہ مرتد ہو سکتے تھے یا مخالفین اسلام کے گروہ سے ملحق ہو کر اسلام ہی کے خلاف صف واحد تشکیل دے سکتے تھے اور شاید مخالفین کی قدرت اور مرکز میں صحیح عدم قیادت کی بناء پر چراغ وحدانیت ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتا۔ (سبحانی، فروغ ابدیت ولایت، ص/۱٦٦)

امیر المومنین علی علیہ السلام دشمنوں کے خطرے اور اس تلخ حقائق کو اچھی طرح نزدیک سے لمس کر رہے تھے لہٰذا آپ نے مصالح ومنافع اسلام کی خاطر مسلحانہ قیام پر سکوت کو ترجیح دی۔

اتحاد کے محافظ

علی علیہ السلام کے لئے اسلامی امت کا اتحاد، بہت اہم واساسی اصل تھی آپ حکومت وقیادت کو بھی اس اصل کی حفاظت سے اہم سمجھتے تھے اور زمانے کے تمام مصائب والام کو اس کے لئے تحمل فرمایا۔

جس وقت علی علیہ السلام پیغمبر اکرمؐ کی تجہیز وتکفین میں مشغول تھے ایک گروہ سقیفہ میں انتخاب خلیفہ کے لئے جمع تھا، ابوسفیان جس کا سیاسی شامہ قوی تھا، جب اس نے ابوبکر کے لئے لوگوں کی بیعت کی خبر سنی اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی زمین ہموار تر دیکھی۔ خطر ارتداد کے علاوہ اسلامی مرکز میں مہاجرین اور انصار کا اختلاف ایک نمایاں امر تھا۔ سقیفہ کے سلسلہ میں مہاجر وانصار کا موقف کہ **منا امیر و منکم امیر**، ان دو گروہ کے مابین شدید اختلاف کی غمازی کر رہا تھا، باوجودیکہ رسول اعظمؐ انصار ومہاجرین کے درمیان الفت وبرادری قائم کرنے کے لئے ہمیشہ بہت کوشش فرماتے تھے (انفال/٦٣) لیکن بعض اشخاص کی عصبیت اور نسل پرستی باعث ہوئی کہ پیغمبر گرامی کی رحلت کے بعد مہاجرین وانصار ہمیشہ ایک دوسرے کو جنگ کی دھمکی دیتے رہیں ابوسفیان جو زمین اختلاف کو اچھی طرح ہموار تصور کر رہا تھا، جیسا کہ اس کا قول ہے کہ ''**انی لاری عجاجة لا یطفوها الا الدم**'' میں وہ طوفان دیکھ رہا ہوں جسے خون کے علاوہ کوئی دوسری چیز ٹھہرا نہیں سکتی ہے۔ (ابن ابی الحدید مدائنی، ج۲ص/

۴۵، احمد بن عبدالرب اندلسی، ج ۴؍ص ۲۴۵؍محمد بن جریر بن یزید، ج ۳؍ص ۲۰۹) لہٰذا اپنے منحوس مقصد کی تکمیل کے لئے امام علی علیہ السلام کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا اور آپ کو مشورہ دیتا ہے کہ آپ ہاتھ بڑھائیں تاکہ میں بیعت کروں، اگر میں بیعت کروں تو عبد مناف قبیلہ کا کوئی فرد آپ کی مخالفت نہیں کر سکتا، اگر فرزندان عبد مناف بیعت کر لیں تو قبیلہ قریش کا کوئی فرد آپ کی بیعت سے سر پیچی نہیں کر سکتا، سرانجام تمام عرب آپ کو فرمانروا تسلیم کر لیں گے۔ (ابن شہر آشوب، ص؍۷۷) امیر المومنین علیہ السلام نے ایسے موقع پر ابوسفیان کے لئے اپنا تاریخی جملہ ادا کیا: ''**ما زلت عدوا للاسلام و اهله**'' اسلام سے تمھاری دشمنی زائل نہیں ہوئی ہے (یوسف بن عبدالبر قرطبی مالکی، ج ۲؍ص ۶۹۰)

ابوسفیان بھی خاموش وساکت نہ رہا، امام علی علیہ السلام اور آپ کے دستوں کے احساسات کو ابھارنے کے لئے اس مضمون کے اشعار کہے:

کہ اپنے غارت شدہ مسلم حق کے مقابل سکوت نہیں کرنا چاہئے۔

بنی هاشم لا تطمعوا الناس فیکم	**ولا سیما تیم ابن مرة او عدی**
فما الامر الا فیکم و الیکم	**و لیس لها الا ابو حسن علی**

(ابن شہر آشوب، ص؍۸۷)

اے فرزندان ہاشم سکوت کو ختم کرو تاکہ لوگ خصوصا تیم وعدی قبیلہ والے تمھارے مسلم حق پر طمع کی آنکھیں نہ گڑائیں، امر خلافت تمھارے لئے اور تمھاری طرف ہے اور حضرت علی علیہ السلام کے علاوہ کسی اور کے لئے شائستہ نہیں ہے۔ علی علیہ السلام ابوسفیان کے منحوس ارادہ سے آگاہ تھے جو اسلام کے نوخیز پودے کو خشک اور فتنہ و آشوب برپا کرنا چاہتا تھا اس کا مقصد ایام جاہلیت کو پلٹانا تھا۔ لہٰذا اس کی پیش کش کو رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں، تیرا مقصد آشوب وفتنہ کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے تو عرصے سے اسلام کا بدخواہ رہا ہے۔ مجھے تیری سیاہ ونصیحت کی

کوئی ضرورت نہیں۔(طبری، ج ۳ص ۲۰۹،ابن ابی الحدید، ج ۲ص ۴۵،علی بن اثیر، ج ۲ص ۷)

نہج البلاغہ میں بھی حضرت علی علیہ السلام ابوسفیان کے اس اقدام کے جواب میں اورعوام کواختلاف کے برے نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں، فتنہ کی موجوں میں نجات کی کشتیوں کے ذریعہ شگاف پیدا کرو دودستگی اوراختلاف سے دوری کرو،فخر فروشی کی علامتوں کوسرے سے ختم کردواگر میں گفتگوکروں تو کہتے ہیں کہ میں قیادت کا حریض ہوں۔اگر خاموش رہوں تو کہتے ہیں میں موت سے ڈرتا ہوں۔خدا کی قسم فرزندابوطالب کا موت سے انس، ماں کے پستان سے بچہ کی محبت سے کہیں زیادہ ہے۔اگرسکوت کرتا ہوں تو خاص علم وآگاہی کی بناپر جس میں غرق ہوں اگرتم بھی میری مانند آگاہ ہوتے تو کنویں کی رسی کی طرح مضطرب ولرزاں ہوتے (نہج البلاغہ،خطبہ ۵)

امام علی علیہ السلام جس علم کی گفتگوکررہے ہیں وہ مسلمانوں کے مابین تفرقہ واختلاف کے وحشت ناک نتائج سے آگاہی کی بناء پرہے، کیوں کہ امام علیہ السلام اچھی طرح جانتے تھے کہ اپنے حق کوحاصل کرنے کے لئے قیام کی قیمت محواسلام اورعقائد جاہلیت کی طرف لوگوں کی بازگشت ہےاسی لئے حضرت، اسلام اورامت اسلامی اتحادکومحفوظ رکھنے کے لئے سکوت کوترجیح دیتے ہیں۔

آپ نے جوخط اہل مصر کے لئےتحریرفرمایااس میں اپنے سکوت کی علت یہی ذکرکی ہے۔خدا کی قسم میں ہرگز گمان نہیں کرتا تھا کہ عرب خلافت کوخاندان پیغمبرؐ سے چھین لیں گے اورمیرے لئے رکاوٹ بنیں گے، میں حیرت زدہ تھا کہ لوگ دوسرے شخص (ابوبکر) کاہاتھ بیعت کے لئے تھام رہے ہیں لہٰذا میں نے اپنے ہاتھ کوروکے رکھا۔میں دیکھ رہا تھا کہ عوام کاایک گروہ اسلام سے پلٹ چکاہےاوردین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کومحوکرنا چاہتا ہے۔میں خوفزدہ تھا کہ اگراسلام ومسلمانوں کی مدد کے لئے شتاب نہ کروں اورپیکراسلام میں رخنہ وویرانی کا مشاہدہ کروں تواس کاغم و اندوہ میرے لئےعظیم اوراس چندروزہ حکومت سے بالاتر ہے جوسراب کے مانند ہے یاابرکی طرح گزرجانے والی

ہے پھر میں حوادث کے مقابل اٹھ کھڑا ہوا اور مسلمانوں کی مدد کی یہاں تک کہ باطل محو ہوا اور سکون و آرام آغوش اسلام (اسلامی معاشرہ) میں پلٹ آیا۔ ہمان نامہ/۶۲)

جیسا کہ مشاہدہ ہوتا ہے امام اس نامہ میں تصریح فرماتے ہیں کہ جب میں نے اسلام اور مسلمین کو خطرے میں دیکھا تو خود کو دعوائے خلافت سے الگ کر لیا۔ حالانکہ میرا حق غصب کر لیا گیا تھا اس سے چشم پوشی کی اور دین و مسلمان کی مدد کے لئے دوڑ پڑا۔ مسلمانوں کے ارتداد اور دینی آسیب وضرر کو روکنا نیز امت اسلامی کے اتحاد کی حفاظت امام علی علیہ السلام کی دوسری گفتگو میں بھی نمایاں ہے، حضرت فرماتے ہیں پیغمبرؐ کے بعد قریش نے ہمارے حق کو چھین کر اپنے سے مخصوص کر لیا۔ میں غور فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ مسلمانوں کے درمیان تفرقہ اور ان کے خون بہائے جانے سے بہتر ہے کہ اپنے غصب شدہ حق پر صبر کروں، عوام نئے مسلمان ہیں اور مختصر سستی دین کو تباہ کر دے گی۔ ممکن ہے معمولی سی فرد دین کو برباد کر دے (ابن ابی الحدید، ج ۱/ص/۳۰۸)

حضرت علی علیہ السلام اپنی حکومت کے اول ایام میں پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے بعد کے حالات جن میں آپ کا حق تلف کر دیا گیا تھا اور آپ کا شمار عام لوگوں میں ہوتا تھا بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ہمارا حق غصب کر لیا گیا تھا ہم عام آدمی قرار دے دیئے گئے تھے ہمارے لوگوں کی آنکھیں گریہ کناں ہوئیں اور تکلیفیں وجود میں آئیں۔ خدا قسم اگر کفر کے پلٹنے اور دین کی تباہی نیز مسلمانوں کے مابین فتنہ کا خوف نہ ہوتا تو ان کے مقابل ہماری رفتار کچھ اور ہی ہوتی۔ میں ان سے پیکار و جنگ کرتا (ابن ابی الحدید ج ۱/ص/۳۰۸، شیخ مفید مصنفات، ج ۱۳/ ص/۱۵۵)

آپ نے حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے موقع پر فقط لوگوں کو اختلاف وتفرقہ سے محفوظ ہی نہیں رکھا بلکہ چھ فردی شوریٰ (کمیٹی) میں بھی شریک ہوئے جسے آپ عثمان اور عبدالرحمٰن کی ایک چال و فریب کے علاوہ کچھ اور تصور نہیں کرتے تھے ایک قول کے مطابق بیعت بھی کی تا کہ مسلمانوں کے درمیان اختلاف

واقع نہ ہو، آپ نے شوریٰ کے ممبران کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: اگر چہ قیادت ورہبری میرا حق ہے اور اسے مجھ سے دور کرنا مجھ پر ظلم ہے جب تک مسلمانوں کے کاج کام صحیح طور سے انجام پاتے رہیں اور فقط مجھ پر جفا ہو تو میں کوئی مخالفت نہیں کروں گا (نہج البلاغہ، خ/۷۴، محمد بن جریر بن یزید، ج/۴ص/۲۲۸)

جلسہ شوریٰ سے قبل پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا عباس نے حضرت علی علیہ السلام کو جلسہ میں حاضر ہونے سے منع فرمایا کیوں کہ اس کا نتیجہ پہلے سے مشخص تھا۔

عثمان کا انتخاب یقینی تھا امام علیہ السلام نے جلسہ کے نتیجہ کے سلسلہ میں جناب عباس کی تائید کرتے ہوئے، ان کی رائے کو قبول نہ کیا اور فرمایا ''انی اکرہ الخلاف من اختلاف ''میں اختلاف کو پسند نہیں کرتا (ابن ابی الحدید، ج/۱ص/۱۹۱) جس زمانہ میں حضرت علی علیہ السلام سکوت اختیار کئے ہوئے تھے حضرت فاطمہ زہراؑ نے آپ کو قیام کی دعوت دی۔ اس وقت موذن کی آواز اشہد ان محمد رسول اللہ کے ہمراہ بلند ہوئی حضرت نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کیا تم چاہتی ہو کہ روے زمین سے یہ صدا خاموش ہو جائے حضرت فاطمہؑ نے کہا ہرگز نہیں، امام علیہ السلام نے کہا صحیح راستہ وہی ہے جسے میں نے انتخاب کیا ہے۔ (ابن ابی الحدید، ج/۱۱ ص/۱۱۳)

جنگ صفین میں قبیلہ بنی اسد کا ایک شخص امام علیہ السلام سے سوال کرتا ہے کہ آپ کو قریش نے کس طرح خلافت سے دور کر دیا۔ حضرت اس بے موقع سوال سے ناراض ہوئے کیوں کہ آپ کی فوج کے بعض سپاہی خلفاء کے معتقد تھے ان مسائل کو ایسے وقت پیش کرنے سے مسلمانوں کی صفوف میں تفرقہ کا اندیشہ ہوتا، لہٰذا امام علیہ السلام نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: پیغمبر اکرمؐ سے تمھاری عزیز داری کے احترام میں نیز اس بناء پر کہ ہر مسلمان سوال کا حق رکھتا ہے، تمھارے جواب کو اجمالی طور سے بیان کرتا ہوں۔ امت کی قیادت ہمارا حق ہے پیغمبرؐ سے ہماری عزیز داری دوسروں کے مقابل محکم ونزدیک تر ہے۔ لیکن بعض اشخاص نے بخل سے کام لیا اور بعض نے اس

حق سے چشم پوشی کی ہمارے اوران کے درمیان داور خدا ہے اور ہم سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے ۔ (نہج البلاغہ، خ ر۱۵۷) امام علی علیہ السلام نے امت اسلامی اتحاد اور اسلام کی حفاظت کے لئے سکوت فرمایا کیوں کہ آپ اچھی طرح ان خطروں سے آگاہ تھے جو نوخیز اسلام اور اسلامی معاشرہ کو تہدید کررہا ہے تھا۔ البتہ امام علیہ السلام کے سکوت کا مفہوم مسلحانہ اقدام کا ترک کرنا ہے ورنہ امام علیہ السلام کبھی بھی اپنے حق سے دست بردار نہ ہوتے ۔ حکومت خلفاء کے تمام دور میں نیز اس کے بعد بھی ہمیشہ کنایۃ تنقید کرتے تھے اور بعض اوقات کوئی عمل انجام دے کر اپنی عدم رضایت وخوشنودی کا اظہار فرماتے ۲ لیکن خلفاء کے ساتھ تعاون میں کوتاہی نہیں کرتے تھے ۔

خلفاء کے لئے امام علی علیہ السلام کی مساعدت

پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے بعد نوخیز دین کے لئے بہت مشکلات پیش آئیں کہ ان سے غفلت اساس اسلام اور اسلامی معاشرے کو خطرہ سے دوچار کر سکتی تھیں، حضرت علی علیہ السلام تاریخ کے اس حساس دور میں بہت زیادہ سعی وکوشش کرتے تھے کہ اپنے انسانی والٰہی وظیفہ کو اسلامی معاشرے کے ثبات اور حفظ دین کے لئے مختلف فکری مساعدت اور مشورے کے قالب میں پیش کریں ۔ آپ ان مشکلات کے مقابل جو اسلام اور امت اسلامی کے لئے درپیش تھیں اور نوخیز دین ومسلمانوں کی بقاوحیات کو خطرے میں ڈال رہی تھیں، لاپرواہ وبے توجہ نہیں رہ سکتے تھے ۔ وہ بھی صرف اس بہانے کہ آپ کے حق کو غصب کرلیا گیا ہے ۔

امام علی علیہ السلام کا خلیفہ اول سے تعاون

بعض موقع پرسب رسول اسلامؐ کی وفات کے بعد اپنے اباواجداد کے دین کی طرف پلٹنا چاہتے تھے ۔ وہ اسلام کی ایمان آوری میں روز اول ہی سے تزلزل میں تھے، خلیفہ اول ان کی سرکوبی کے لئے بزرگ اصحاب خصوصاً امام علی علیہ السلام کی حمایت کے شدید ضرورتمند تھے اس لئے کہ اگر علی علیہ السلام اس مسئلہ میں خلیفہ کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے تو بہت سی مشکلیں تیزی سے حل ہو جاتیں چوں کہ علی علیہ السلام ایک عظیم شخصیت اور

معاشرے میں خاص مقام واعتبار رکھنے کے علاوہ ایک بزرگ ومعتبر قبیلہ بنی ہاشم کے رئیس وقائد تھے اور اکثر بنی ہاشم آپ کی پیروی وحمایت کرتے تھے۔ امام علیہ السلام کے بہت سے معتقدین کا شمار بزرگ اصحاب میں ہوتا تھا اور آپ سماج ومعاشرے میں خاص مقام ومقبولیت رکھتے تھے جیسے عمار یاسر، مقداد، ابوذر غفاری، سلمان وغیرہ کہ یہ ان میں سے چند نمونے ہیں، خلیفہ کے لئے امام علی علیہ السلام کی حمایت ہونے کی صورت میں یقیناً عظیم قبایل وطوائف میں سے ایک عظیم دستہ آپ کی پیروی واطاعت کرتے ہوئے حکومت کی ہمراہی کرتا کہ یہ خلیفہ کے لئے قابل توجہ قدرت محسوب ہوسکتی تھی۔

حضرت امام علی علیہ السلام کا میدان عمل میں محتاطانہ حضور سبب بنا کہ آپ کے پیروشیعہ بھی اسلام کی حمایت کی خاطر آپ کی اطاعت کرتے ہوئے میدان میں حضور کوواجب سمجھیں لہٰذا یہ لوگ مرتدین اسلام کی نابودی کے لئے میدان میں آگئے اور اس سلسلہ میں اہم کردار ادا کیا، جیسا کہ تاریخ الردہ کے مولف نے حذیفہ بن یمانی اور عدی بن حاتم جو امام علی علیہ السلام کے شیعہ وصحابی میں سے ہیں اپنے قبیلہ کے مرتدین کو روکنے والوں میں شمار کیا ہے ۔(کلاعی البلنسی وھذ بہ، اقتبسہ من الاکتفا خورشید احمد فاروق، ص۱۷)

امام علی علیہ السلام کے دوسرے اصحاب جیسے عبداللہ بن مسعود، طلحہ وزبیر ان اشخاص میں سے ہیں جو خلیفہ اول کی جانب سے مدینہ کے دروازوں پر معین کئے گئے تھے تا کہ مرتدین قبایل کے حملہ سے مدینہ کی حفاظت کریں اور جس وقت مرتدین شبانہ حملہ آور ہوئے تو انھوں نے جان پر کھیل کر مدینہ کی حفاظت کی ہے(ہمان، ص۵)

سب سے اہم، خلیفہ اول کے لئے آپ کی خیر خواہانہ نصیحت ہے جب وہ ذوالقصہ(مدینہ سے ایک میل کے فاصلے پر ایک مقام) میں مسلح مرتدین کے مقابل گھوڑے پر سوار گروہ میں تھے کہ امام علی علیہ السلام نے انھیں اس ارادہ سے منصرف ہونے کا مشورہ دیا اور فرمایا اگر خلیفہ ان سے مبارزہ کے لئے خود مدینہ سے خارج ہوتو کبھی بھی اسلامی معاشرے میں نظم وضبط برقرار نہیں ہوسکتا ابوبکر بھی حضرت کی نصیحت کوقبول کیا اور اہل ردہ سے مقابلہ کے لئے

خالد بن ولید کو بھیجا۔ (ابن کثیر القرشی الدمشقی، ج/۶ ص/۳۱۵)

عسکری مشورت

خلافت ابوبکر کا ایک سال سے زیادہ عرصہ مرتدین، کاذبین پیغمبرؐ اور مانعین زکواۃ سے مقابلہ و جنگ میں ختم ہوا خلیفہ اول غائلہ ردہ ختم ہونے کے بعد ایک سال سے زیادہ زندہ نہ رہے اور اپنے بعد کی فتوحات حاصل نہ کر سکے۔ ان کی لشکر کشی فقط شام میں اہل روم کے مقابل خلاصہ ہوئی ہے۔ خلیفہ، امام علی علیہ السلام کی شجاعت فداکاری، جنگی مہارت و تجربہ سے آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ کافروں سے جنگ میں آپ کے فیصلہ کن کردار نے آپ کو ایک بے مثال مرد جنگ بنا دیا ہے۔ لہٰذا ان کے تاثیر گزار کردار سے غافل نہیں رہا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف فتوحات و جنگ میں آپ کی عدم شرکت اور گوشہ نشینی معاشرے میں سوال انگیز ہو سکتی ہے کہ علیؑ کیوں روم کے کفار کے مقابل بے توجہ اور علیحدہ ہیں۔ بہ طور یقین سب کے لئے واضح تھا کہ اس کی وجہ موت سے ڈر و خوف یا جہاد کے لئے سستی و کاہلی نہیں ہے لہٰذا وہ علت کیا ہے کہ میدان جنگ کا قہرمان عرب کا شجاع ترین شخص علیحدہ و گوشہ نشین ہے؟ یہ وہ سوال تھا کہ اس عصر کے معاشرے میں پیش آ سکتا تھا۔ لہٰذا خلیفہ اور ان کے ہمراہی کوشش کرتے تھے کہ آپ کو جنگ و فتوحات میں آپ کی شرکت کے وسیلہ اس اقدام کے جواز و اعتبار کو آپ کے جاننے والوں خصوصا بنی ہاشم میں قوی کریں۔

اسلام کی وسعت اور فتح و کامرانی ہر مسلمان کی خواہش و پسند ہے۔ علی علیہ السلام نے ان جنگوں اور فتوحات میں خود نفس نفیس شرکت نہیں فرمائی فقط اس سلسلہ میں مشورت اور فکری مساعدت کی ہے۔

قزوینی کہتے ہیں: آپ مدینہ میں شریعت اسلام کی حفاظت کے لئے معاشرے کی مشکلات کو بیان فرماتے نیز مشکلات کو حل کرتے اور شریعت کے احکام کی تشریح و تفصیل فرماتے تھے ۔ (قزوینی رازی، سید جلال الدین محدث، ص/۳۱۰)

تاریخی کے مطابق پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے بعد مدینہ کی سیاسی فضا بحران سے دوچار ہونے کے بعد آرام و معمول کے مطابق ہونے لگی اور ابوبکر نے زمام امور کو ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ خلیفہ پیغمبر اسلامؐ کے فرمان یعنی اہل روم سے جنگ کے سلسلہ میں کا ملا مردد تھے۔ بعض صحابہ سے مشورہ کیا ہر ایک نے اپنی رائے پیش کی مگر خلیفہ قانع نہ ہوئے آخر کار علی علیہ السلام سے مشورت انجان دیا۔ آپ نے ان کو پیغمبر اکرمؐ کے حکم کو اجرا کرنے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ اگر مسلمان اہل روم سے جنگ کریں گے تو کامیاب ہوں گے خلیفہ امام علی علیہ السلام کے مشورہ سے خوشحال ہو گئے۔ (ابن عساکر علی بن حسن، ص ۴۴۴/) ، پھر عوام کو مخاطب کر کے کہا اے مسلمانوں یہ علیؑ علم پیغمبرؐ کے وارث ہیں جو شخص ان کی سچائی میں شک کرے وہ منافق ہے علیؑ کی گفتگو نے مجھے اہل روم سے جہاد کرنے کے لئے تشویق و تحریص کی ہے، اور میرا دل بہت خوش ہوا ہے۔ اس جنگ میں اسلام کی فوج بڑی فداکاری جدوجہد کے ذریعہ عظیم کامیابی سے ہمکنار ہوئی اس جنگ میں بعض علی علیہ السلام کے شیعہ واصحاب بھی شریک تھے۔

علمی مساعدت

یہودی عالم سے مناظرہ

پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے بعد ابوبکر کو خلیفہ بنائے جانے کی وجہ سے یہودی و نصرانی کے بعض علماء اسلام کی تضعیف کے ارادہ سے مرکز اسلام یعنی مدینہ آتے اور خلیفہ سے بعض علمی سوال کرتے تھے تاکہ جواب نہ ملنے کی صورت میں اسلام کو بدنام کریں لہٰذا اسی ارادہ سے یہودیوں کا ایک گروہ مدینہ وارد ہوا اور خلیفہ سے عرض کی ہم نے توریت میں پڑھا ہے کہ پیغمبروں کے جانشین اس امت کے عالم ترین فرد ہوتے ہیں لہٰذا آپ جواب دیں کہ خدا کہاں ہے، آیا خدا آسمان پر ہے یا زمین پر تشریف رکھتا ہے خلیفہ نے ایسا جواب دیا جس سے وہ قانع نہ ہوئے، ابوبکر نے عرش کو خدا کا مکان قرار دیا تھا یہودی عالم نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین خدا کے وجود سے خالی ہے؟ اس حساس وقت میں امام علی علیہ السلام اسلام اور اسلامی امت کی آبرو کے لئے میدان میں وارد ہوئے اور فرمایا، خدا

مکانوں کوخلق کرنے والا ہے لہٰذا وہ مکانوں سے بالاتر ہے مکان اس کی وسعت کونہیں پا سکتے ہیں وہ سب جگہ ہے لیکن کسی موجود کے ہمراہ ومجاور نہیں ہے۔ وہ تمام اشیاء پر عملی احاطہ رکھتا ہے کوئی شئے اس کی قلمرو وتدبیر سے خارج نہیں ہے۔ (شیخ مفید، الارشاد، ص/۱۰۸، الباب الثانی فصل ۵۸) امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے آشکار ترین دلیل کے ذریعہ ایک عالمانہ جواب فرمایا اور یہودی علماء کواس طرح حیرت میں غرق کر دیا کہ انھوں نے بے اختیار آپ کے قول کی حقانیت کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کوخلافت کے لئے شائستہ ترین فرد اعلان کیا۔

نقل کیا جاتا ہے کہ یہودی شخص مسلمانوں کے قائد کو پوچھتا ہوا مدینہ میں وارد ہوا، لوگ اسے ابوبکر کے پاس لائے اس نے ابوبکر کو مخاطب کر کے کہا میں آپ سے چند سوال کرتا ہوں جس کا جواب انبیا اوران کے اوصیا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے اس نے تین سوال پیش کئے؟

۱۔ وہ چیز کیا ہے جسے خدا نہیں رکھتا؟

۲۔ وہ کیا چیز ہے جو خدا کی بارگاہ میں نہیں ہے؟

۳۔ وہ کیا چیز ہے جس کو خدا نہیں جانتا ہے؟

خلیفہ جواب نہیں دے سکے، کہنے لگے ان سوالوں کو منکرین خدا وجود میں لائے ہیں لہٰذا اس یہودی کو سزا دینے کا حکم صادر فرمایا، اس مجلس میں ابن عباس حاضر تھے، خلیفہ کے فعل پر اعتراض کرتے ہوئے بولے تم نے انصاف نہیں کیا اس شخص کا جواب دو یا اسے علی علیہ السلام کے پاس لے چلو، ابوبکر اور حاضرین جلسہ علی علیہ السلام کے پاس حاضر ہوئے خلیفہ نے امام علیہ السلام سے کہا یہ یہودی کفر آمیز سوال کرتا ہے، آپ نے یہودی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا وہ چیز جسے خدا نہیں جانتا وہ عزیر کے سلسلہ میں تم یہودیوں کا قول ہے کہ تم عزیر کو خدا کا فرزند قرار دیتے ہو خدا فرزند ہی نہیں رکھتا کہ اسے جانتا ہو، وہ شئے جو بارگاہ الٰہی میں موجود نہیں وہ اپنے بندوں پر ظلم ہے وہ شئے جو خدا نہیں رکھتا وہ خدا کا شریک ہے۔

اس موقع پر یہودی نے زبان پر کلمہ شہادتین جاری کیا اور امام علی علیہ السلام کو پیغمبرؐ کا وصی اعلان کرتے ہوئے ایمان لے آیا ابوبکر اور مسلمانوں نے آپ کو مفرج الکرب (مشکل کو دور کرنے والا) کے لقب سے یاد کیا۔

(محمد بن بن دربداز دی، ص ر۴۳)

قضاوتی مساعدت

امام علی علیہ السلام نے خلیفہ اول کے دور میں قضاوتی مسائل میں بھی مساعدت فرمائی ہے جس کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں:

نقل کیا جاتا ہے کہ خلافت ابوبکر کے دور میں ایک شخص کو شراب پینے کے جرم میں ابوبکر کے پاس لایا گیا، اس فرد نے اپنے گناہ کا اعتراف بھی کیا اور کہا میں اس جگہ زندگی کرتا ہوں جہاں شراب کا پینا اور مردار کھانا حلال سمجھا جاتا ہے۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ شراب حرام ہے تو نہیں پیتا۔ خلیفہ نے اس شخص کا حکم خلیفہ دوم سے پوچھا عمر نے کہا یہ وہ مشکل ہے جسے علی علیہ السلام کے علاوہ کوئی اور حل نہیں کرسکتا ہے لہذا تینوں امام علی علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے امام نے فرمایا اس شخص کو مہاجرین وانصار کے سامنے پیش کیا جائے اور ان سے سوال کیا جائے کہ کسی نے اس شخص کے لئے تحریم شراب کی آیت تلاوت کی ہے یا نہیں، ان لوگوں نے ایسا ہی کیا اور جب ثابت ہوگیا کہ انصار و مہاجرین میں کسی نے بھی اس کے لئے تحریم شراب کی آیت تلاوت نہیں کی تھی تو اس شخص کو آزاد کردیا گیا۔ (محمد بن حسن طوسی، ج ۱ص ر۱۰۸ کتاب الحدود، ح ر۳۵۹)

امام علی علیہ السلام خلیفہ دوم کے عصر میں

آئین اسلام کی وسعت اور اسلامی معاشرے کی عظمت کی حفاظت امام علی علیہ السلام کے عظیم و بلند مقاصد میں سے تھے۔ آپ خود کو پیغمبر اکرمؐ کا وصی وجانشین برحق سمجھتے تھے، حالانکہ آپ دیکھ رہے تھے آپ کا حق چھین لیا گیا ہے اور مسند خلافت غصب کرلی گئی ہے اس کے باوجود جب بھی خلافت کے لئے مشکل کھڑی ہوتی آپ

بلند فکر و نظر کی بنا پر حل فرماتے تھے۔ خلیفہ اول کے عصر خلافت کی طرح خلیفہ دوم کے زمانہ خلافت میں بھی عسکری سیاسی، علمی وقضاوتی واقتصادی مشورت ومساعدت نیز مشکلات کو برطرف کرنا آپ کے علمی اقدامات تھے۔

الف۔ عسکری مساعدت

خلیفہ دوم کے زمانہ میں جنگ وفتح وسیع پیمانے پر انجام دی گئی ہے اس سلسلہ میں علی علیہ السلام کا کردار خلیفہ اول کے دور کی نسبت زیادہ واضح وآشکار ہے۔ آپ کی شجاعت ودلاوری اور جنگی تجربہ کی بنا پر آپ کی راہنمائی و مساعدت سے خلیفہ دوم غفلت نہیں کر سکتے تھے وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ آپ مستقیما جنگ میں شرکت کرنے پر آمدہ نہیں ہیں لیکن آپ سے مشور اور فکری مساعدت حاصل کی جا سکتی ہے امام علی علیہ السلام بھی چوں کہ اسلام اور مسلمین کی سرنوشت سے بے توجہ نہیں رہ سکتے تھے لہذا مشورہ اور اظہار خیال کے قالب میں مساعدت فرماتے تھے۔ خلیفہ دوم کی فکری مساعدت ومشورہ کے چند نمونے پیش کئے جا رہے ہیں۔

۱۔ نبرد جسر

اس نبرد میں مسلمین شکست سے دوچار ہوئے، خلیفہ دوم نے مسلمانوں کو جمع کر کے انھیں جہاد کے لئے رغبت دلائی اور اصحاب پیغمبر خصوصا امام علی علیہ السلام سے مشورہ کیا کہ کیا خود سپاہ کی مدد کے لئے جائیں یا کسی اور شخص کو بھیجیں۔ علی علیہ السلام نے فرمایا، خلیفہ خود نبرد کے لئے نہ جائے۔

(سعودی، ج۲ص/۳۱۸و۳۱۹)

۲۔ اہل روم سے جنگ

قیصر روم کی سپاہ کے مقابل سپاہ اسلام کی جنگ کے زمانے میں ابوعبیدہ نے خلیفہ سے مزید امداد کا مطالبہ کیا، خلیفہ نے بزرگان صحابہ سے مشورہ کیا اور امام علی علیہ السلام سے اس سلسلہ میں رائے چاہی آپ نے خلیفہ سے کہا۔ سپاہ اسلام مقاومت کرے جلد ہی کامیابی نصیب ہوگی، (واقدی، ص/۱۰۸)

۳۔ نبرد بیت المقدس

بیت المقدس کی جنگ اور فتح میں بھی خلیفہ دوم نے اصحاب پیغمبرؐ خصوصا امام علی علیہ السلام سے مشورہ چاہا اور امام کے مشورے و گفتگو سے خلیفہ دوم اس قدر شاد وخوش ہوئے کہ اصحاب سے کہنے لگے میں علی علیہ السلام کے مشورے وسخن کے علاوہ کچھ اور عمل نہیں کرسکتا ان کا مشورہ قابل تعریف ہے اوران کی پیشانی سفید ہے۔(واقدی،ص/۱۴۸)

۴۔ جنگ خراسان

خراسان کی جنگ میں امام علی علیہ السلام نے خلیفہ دوم کے لئے ہر ایک شہر کی خصوصیت وامتیاز کو بتادیا تھا اور وہاں کی فتح کے لئے خلیفہ دوم کی تشویق کی تھی۔(ابن اعثم، ج/۲ص/۷۸)

جنگ میں شیعیان علی کے نقوش

خلیفہ دوم کے عصر میں برپا شدہ جنگوں میں شیعیان علی علیہ السلام کے موثر نقوش خصوصی طور سے نمایاں ہیں ہمسایہ سرزمین کی فتح میں اسلام کی کامیابی علی علیہ السلام کے شیعوں کی دلیری وشجاعت کی مرہون منت ہے ان جنگوں میں آپ کے چاہنے والوں کی شرکت آپ کی اجازت کے بغیر نہ تھی، جیسا کہ سلمان فارسی کے لئے جب مدائن کی گورنری پیش کی گئی تو پہلے آپ نے امام علی علیہ السلام سے اجازت لی پھر قبول فرمایا:(مرتضی عاملی فصلنامہ تاریخ سن اول شمارہ۳ص/۳۷۸) جناب مالک اشتر قادسیہ کی جنگ میں حاضر تھے۔(دینوری،ص/۱۲۰)اور آمدو نصیبین،آپ کے ہاتھوں سے فتح ہوئے (ابن اعثم ج،/اص/۳۴)

جناب حذیفہ بن یمانی نہاوند کی جنگ میں سپاہ کے قائد تھے(ابن عثمان ذہبی، ج/اص/۲۵) دینوری کی روایت کے مطابق آپ نعمان بن مقرن کے بعد سپاہ اسلام کی قیادت کے عہدہ پر فائز ہوئے تھے(احمد بن داؤد دینوری،ص/۱۳۵) جناب عمار یاسر مصر کی فتح میں سوار نظام کے پیشوا تھے(ابن اعثم، ج/۲ص/۳۶)اور دیار بکر کی

فتح میں بھی مقداد بن اسود کے ہمراہ حاضر تھے، ابن اعثم ج ۲/ص ۵۹) ہاشم بن عتبہ مرقال، سعد بن ابی وقاص کے بھتیجے تھے اور امام علی علیہ السلام کے باوفا وفدا کار اصحاب میں سے تھے وہ خلیفہ دوم کے عصر میں پانچ ہزار فوج کے سردار تھے اور فتح بیت المقدس میں بھی حاضر تھے۔ (واقدی ص ۱۴۴) وہ فتح آذربائجان میں سپاہ کے ایک گروہ کے رئیس تھے (طاہر بن مطہر مقدسی ج ۵/ص ۱۸۲) جریر بن عبداللہ بجلی جنگ قادسیہ میں سپاہ کے سرداروں میں تھے اور جلولاء میں بھی حاضر تھے اور عراق وحیرہ پر حملہ میں سپاہ کی قیادت ان کے ہاتھوں میں تھی (احمد یعقوب ج ۲/ص ۱۳۰) امام علی علیہ السلام کے شیعیوں کا خلفاء کے زمانہ میں جنگوں میں شرکت کا مقصد اسلامی ممالک کی توسیع کے علاوہ اسلام کو وسعت بخشنا تھا۔

امام علی علیہ السلام کے شیعہ اور حکومت

امور حکومت اور سیاسی میدان میں آپ کے بعض شیعوں کا حضور اتحاد کی حفاظت اور آپ کے اذن کی بنا پر تھا، جیسا کہ سلمان فارسی فتح مدائن کے بعد سعد ابن وقاص کے ذریعہ، خلیفہ کی طرف سے وہاں کے والی مقرر ہوئے (ابن اعثم کوفی ج ۱/ص ۲۸۶) اور عمار یاسر خلیفہ کی طرف سے کوفہ کے والی بنائے گئے (طاہر بن مطہر، ج ۵/ ص ۱۸۰)

حکومت میں علی علیہ السلام کا حضور

اسلامی امت کا اتحاد آپ کے لئے اس قدر اہم تھی کہ آپ بعض وقت اپنے غاصب حق کی جانشینی کو بھی قبول کر لیتے ہیں۔ جس وقت خلیفہ مسلمانوں کے اہم امور کی بناء پر مدینہ سے باہر جاتے تو علی علیہ السلام کو مدینہ میں اپنا جانشین قرار دیتے اور لوگوں کو آپ کی اطاعت کا حکم دیتے تھے حالاں کہ امام علی علیہ السلام کا حق غصب کیا جاچکا تھا لیکن آپ اسلامی امت کی سرنوشت اور اتحاد سے مربوط مسائل میں کوتاہی نہیں کرتے تھے امام علی علیہ السلام نے عمر کے عصر خلافت میں تین مرتبہ بطور جانشین شہر مدینہ کے امور کی ذمہ داری سنبھالی ہے۔

۱۔ امام علی علیہ السلام کو خلیفہ دوم کی جانب سے مدینہ میں جانشین قرار دیئے جانے کا پہلا مورد اس وقت ہے جب خلیفہ دوم شام کی طرف حرکت کر رہے تھے۔ خلیفہ نے اہل مدینہ اور لشکر اسلام کے درمیان ایک خطبہ بڑھا جس میں حمد و ثنا خدا کے بعد کہا، ایھا الناس انی خارج الی الشام ...فقالوانعم سمعا وطاعۃ (احمد بن اعثم کوفی ج ۱/ص ۲۲۵) اے لوگو میں شام کی طرف جا رہا ہوں اگر مسلمانوں کے لئے خطرہ اور تہدید کا خوف نہ ہوتا تو میں ہرگز مدینہ سے خارج نہ ہوتا علی بن طالب مدینہ میں ہیں تمھاری نظریں ان کی طرف ہوں میں نے تمھارے امور ان کے حوالہ کر دیئے ہیں اور وہ تمھارے اوپر حاکم ہیں۔ ان کی گفتگو کو سنو اور ان کی اطاعت کرو۔ میں نے جو کچھ کہا، کیا تم نے اسے اچھی طرح سمجھ لیا ہے تمام حاضرین نے کہا، ہاں ہم نے سن لیا ہے اور ان کی اطاعت کریں گے۔

۲۔ آپ کو خلیفہ کی طرف سے جانشین بنائے جانے کا دوسرا وقت وہ ہے جب خلیفہ نے علی علیہ السلام سے مشورہ کرنے کے بعد قادسیہ و جسر میں نبرد کرتی ہوئی سپاہ اسلام کی مدد کے لئے مدینہ سے خارج ہونے کا ارادہ کیا تو آپ کو مدینہ میں اپنا جانشین قرار دیا (ابن اثیر، الکامل فی تاریخ، ج ۲/ص ۳۰۹)

۳۔ اس سلسلہ میں تیسرا موقع وہ ہے جب خلیفہ نے علی علیہ السلام سے مشورہ کرنے کے بعد بیت المقدس جانے کا ارادہ کیا تا کہ وہاں صلح برقرار کریں۔ کیوں کہ خلیفہ کے حضور کے بغیر صلح ممکن نہ تھی۔ اس موقع پر علی علیہ السلام کو مدینہ میں اپنا جانشین قرار دیا اور فلسطین کے لئے روانہ ہوئے۔ (واقدی، ص/۱۴۹)

امور حکومت میں امام علی علیہ السلام کے حضور کے سلسلہ میں جو کچھ ملاحظہ ہوا وہ اہل سنت کے معتبر منابع سے پیش کیا گیا ہے۔ بعض شیعہ مورخین جیسے شریف رضی نے بھی امور حکومت میں امام علی علیہ السلام کے حضور کو تحریر کیا ہے۔ جس وقت خلیفہ شام کی طرف جا رہے تھے عباس بھی ان کے ہمراہ تھے خلیفہ نے عباس سے کہا شاید تم امر خلافت میں اپنے کو زیادہ صاحب حق سمجھتے ہو، عباس نے جواب دیا اس امر میں ہم دونوں سے زیادہ صاحب حق وہ ہے جو مدینہ میں تمھارا جانشین بنا ہوا ہے، وہی جس نے ہمیں شمشیر کے ذریعہ اسلام میں داخل کیا ہے یعنی وہ فرد علی

بن ابی طالب ہے۔(شریف رضی،ص؍۷۷)

ب)۔ سیاسی مشورے

خلیفہ دوم سیاسی امور میں بھی امام علی علیہ السلام کے ارشادات کے محتاج تھے۔مختلف امور خصوصا سیاسی مشوروں میں آپ کی خیر اندیشی و وسیع النظری اسلامی معاشرے کے استحکام وتقویت کا سبب بنی ہے۔

۱۔ جیسا کہ نقل کیا گیا ہے کہ بعض علماء نے اظہار کیا ہے عجم یعنی ہمدان ، ری ، اصفہان ، نہاوند و ..... کے باشندوں نے دوسرے شہروں میں خط لکھا کہ پیغمبر اکرمؐ دنیا سے تشریف لے گئے اس کے بعد ان کا حاکم ابوبکر بھی ہلاک ہوگیا،اس کے بعد عمر جو طولانی عمر والا ہوگا اور تمھارے شہروں بھی مورد تجاوز قرار دے گا لہٰذا عمر کے لشکروں کو اپنے شہروں سے باہر کردو،اوران سے نبرد کے لئے اٹھ کھڑے۔ہو عمر اس خبر کی اطلاع پاتے ہی سراسیمہ مسجد میں وارد ہوئے اور مہاجرین وانصار سے اس امر میں مشورہ کیا۔ ہر ایک نے کچھ اس طرح بیان کیا کہ خلیفہ قانع نہ ہوئے سرانجام امام علی علیہ السلام نے فرمایا میری رائے یہ ہے کہ شام،یمن،مکہ ومدینہ کے افراد کو ان کی جگہ سے حرکت نہ دو اور بصرہ کے لوگوں سے کہو کہ تین گروہ ہو جائیں ان میں سے ایک گروہ بصرہ میں عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے لئے بصرہ میں رہے دوسرا گروہ اہل ذمہ کے سر پر مسلط رہے تاکہ عہد شکنی نہ کریں اور تیسرا گروہ اپنے بھائیوں کی مدد کے لئے روانہ ہو جائے،عمر نے کہا،ہاں صحیح و درست رائے یہی ہے میں اس رائے کا مطیع ہوں م عمر علی علیہ السلام کی گفتگو کو مکرر زبان پر جاری کرتے ہوئے اور اس حکیمانہ سخن کو دہرایا کرتے تھے۔(شیخ مفید الارشاد باب ثانی فصل ۶)

۲۔ خلیفہ فتح مدائن کے بعد،ربیع الاول کی سولہویں ہجری میں تاریخ ثبت کرنے کا ارادہ کیا اور سرانجام خلیفہ نے امام علی علیہ السلام کی نظر کو قبول کیا اور تاریخ کو پیغمبر اکرم کی ہجرت سے مقرر فرمایا(بن عساکر ج؍اص؍۳۶ حاکم نیشاپوری،ج؍۲ص؍۱۴)

ج)۔ اقتصادی مشورے

یقیناً امام علی علیہ السلام کی درایت اور دور اندیشی تمام اصحاب پیغمبرؐ سے زیادہ تھی لہٰذا جب بھی خلفاء متعدد موارد میں مشکلات سے دوچار ہوتے تو حضرت کی طرف رجوع کرتے اور آپ سے راہ حل کے خواہاں ہوتے تھے۔ اقتصادی اور حکومتی اراضی و معاشرے کی مشکلیں ان موارد میں سے تھیں کہ خلیفہ مشورہ کے لئے آپ کی طرف رجوع کرتے اور صحیح راہ حل دریافت کرتے تھے۔

۱۔ بیت المال سے دریافت کا پیمانہ

وہ فرد جو معاشرے میں رہبری کا عہدہ دار ہے وہ مخارج زندگی کے لئے بیت المال سے معین مبلغ لینے کا حقدار ہے عمر نے اپنے عصر خلافت میں صحابہ خصوصا امام علی علیہ السلام سے اس موضوع میں مشورہ کیا اور آخر کار آپ کے نظریہ کو قبول کیا۔ آپ نے فرمایا اس مقدار میں بیت المال سے اخذ کرنے کا حق رکھتا ہے کہ اس کے اور اہل و عیال کے مخارج زندگی پورے ہوجائیں (ابن ابی الحدید ج ۱۲/ص ۲۲۰، ابوالفرج جوزی، ص/۹۷)

۲۔ جواہر کعبہ کا مصرف

خلیفہ دوم کعبہ کے جواہرات کو سپاہ اسلام پر خرچ کرنا چاہتے تھے امام علی علیہ السلام نے فرمایا چوں کہ پیغمبر اسلامؐ نے اسے کہیں صرف نہیں کیا ہے لہٰذا آپ بھی اسے استعمال نہ کریں۔ عمر نے آپ کے سخن کو قبول کیا اور لــــو لاک لا فتحضنا کا نعرہ بلند کیا (امینی ج ۲/ص ۱۷۷، سید محسن امین، ج ۱/ص ۴۳۶)

۳۔ سرزمین عراق کی تقسیم

خلیفہ دوم نے اطراف کوفہ کی حاصل خیز زمین کے سلسلہ میں جو مسلمانوں نے حاصل کی تھی، امام علی علیہ السلام کی رائے جاننا چاہی، آپ نے فرمایا اگر زمین کو مسلمانوں کی موجودہ نسل میں تقسیم کروگے تو مستقبل کے مسلمانوں کے لئے کوئی فائدہ نہیں ہوگا لیکن اگر زمین ان کے مالکوں کے پاس باقی رہے اور وہ زمین سے استفادہ

کرتے ہوئے اسلامی حکومت کو ٹیکس ادا کریں تو دونوں نسل یعنی موجودہ وآئندہ نسلوں کے لئے فائدہ مند ہوگا، خلیفہ دوم نے اس سخن کو یہ کہتے ہوئے قبول کیا کہ یہ فکر بہت اچھی ہے، (احمد بن یعقوب، ج ۲/ص ۱۵۱

د۔ علی علیہ السلام اور عدالتی امور

حضرت علی علیہ السلام اس دوران اپنی راہنمائی و جواب کے ذریعہ عدلیہ کے امور بھی خلیفہ کے لئے مورد ابتلاء مسائل کو حل فرماتے تھے چند نمونہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ایک مجنون عورت زنا کی مرتکب ہوئی تھی اسے عمر کے پاس لایا گیا عمر نے لوگوں سے مشورت کے بعد اسے رجم کرنے کا حکم فرمایا۔ امام علی علیہ السلام اس واقعہ سے مطلع ہوئے عورت کو واپس کرنے کا حکم دیا اور خلیفہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کیا تم نہیں جانتے تین گروہ سے قلم اٹھالیا گیا ہے ایک مجنون جب تک سالم نہ ہوجائے دوسرا سویا ہوا شخص جب تک بیدار نہ ہوجائے تیسرا بچہ جب تک بالغ نہ ہوجائے، عمر نے صدائے تکبیر بلند کی اور عورت کو آزاد کرنے کا حکم دیا۔ (محمد اوس قلعہ چی، ج /ا ص/ ۲۹)

۲۔ نقل کیا گیا ہے کہ ایک عورت کو جس نے عدہ کی حالت میں شادی کیا تھا عمر کے پاس لایا گیا عمر نے عورت سے مہر لے کر بیت المال کے سپرد کر دیا اور عورت و مرد کے مابین ابدی جدائی کا دستور دیتے ہوئے سزا کا حکم دیا، امام علیہ السلام نے اس حکم کو غلط قرار دیتے ہوئے حکم دیا عورت و مرد ایک دوسرے سے جدا ہوں اور عورت پہلے عدہ کو کامل کرے پھر دوسرا عدہ دوسری شادی کی بناء پر رکھے، اور شوہر دوم عورت سے مجامعت کی بنا پر مہر المثل ادا کرے۔ (بیہقی، ج /۱۱ص/ ۴۲۶)

۳۔ عمر نے شراب پینے والے کی حد چالیس تازیانہ قرار دے رکھی تھی جس کی بنا پر شراب خواری میں اضافہ ہوتا جارہا تھا عمر نے اس سلسلہ میں اصحاب پیغمبرؐ سے مشورہ کیا، امام علی علیہ السلام نے شراب خواری کے لئے اسی تازیانہ لگائے جانے کا حکم دیا اور استدلال یہ فرمایا کہ شراب خوار مست ہوجاتا ہے جس کی بناء پر عقل زائل ہوجاتی

ہے اور ہذیان میں مبتلا ہو جاتا ہے اس حالت میں وہ دوسروں پر تہمت وافتراء انجام دے گا لہٰذا شراب خور کی سزا تہمت وافتراء والی سزا ہونی چاہئے خلیفہ دوم نے امام علی علیہ السلام کے نظریہ کو قبول کیا اور اس کے بعد شارب الخمر کی سزا ۸۰ تازیانہ قرار دی (محمد ابن ابی یعلی الغراء، ص ۲۲۸)

ھ۔ علی علیہ السلام علمی مرجع

پیغمبر اکرمؐ کے بعد اسلام کی وسعت اور ترقی زمانہ، باعث ہوئی کہ مسلمان بعض ایسے جدید مسائل سے روبرو ہوئے کہ ان کا حکم قرآن وروایت میں (باصراحت) موجود نہ تھا۔ مسلمین ان مسائل کو حل کرنے میں مشکل کا شکار تھے۔ بعض اصحاب اس نوعیت کے موارد میں قرآن وروایات سے تمسک کرنے کے بجائے ظن وگمان یا اپنی راہ پر عمل کرتے تھے علی علیہ السلام جوامت اسلام کے اعلم اور شہر علم پیغمبرؐ کے دروازہ تھے (متقی ہندی، ج ۱۱ص ۶۰۰ و ۶۱۴، ابن ابی الحدید، ج ۷ص ۲۱۸، محمد باقر مجلسی، ج ۳۳ص ۱۱۸) خلفاء خصوصا عمر کی جوان جدید مسائل کو حل کرنے میں ناتواں تھے مدد کرتے تھے اور الٰہی حکم کو بیان کرتے تھے لہٰذا عمر ہمیشہ **لو لا علی لھلک عمر** کہتے ہوئے نظر آتے تھے (امینی، ج ۳ص ۹۷)

تاریخ اس سلسلہ میں امام علی علیہ السلام کی بہت زیادہ مساعدت وکمک کو بیان کرتی نظر آتی ہے، معاویہ کا بھی کہنا ہے کہ عمر کے لئے جب بھی کوئی مشکل پیش آتی تو تھی امام علی علیہ السلام کی طرف رجوع کرتے تھے (امینی، ج ۳ص ۹۸، احمد طبری، ص ۹۷) اور حضرت بھی عالمانہ جواب عطا کرتے تھے، خلفاء امام علی سے شرعی احکام معلوم کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتے تھے۔ حتی عام مجمع میں بھی سوال کرتے اور امام علی علیہ السلام سے جواب حاصل کرتے تھے، بعض وقت اپنے اطرافیوں کی طرف سے مورد ملامت بھی قرار پاتے تھے۔ بطور مثال دو شخص نے طلاق کے سلسلہ میں خلیفہ دوم سے سوال کیا، عمر نے پیچھے مڑ کر امام علی علیہ السلام سے اس مسئلہ کا جواب چاہا، امام علیہ السلام نے اپنی دو انگشت کے ذریعہ اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا عمر نے بھی جواب کو سائلین تک منتقل کر دیا، انھوں

نے اعتراض کیا کہ ہم تم سے سوال کرتے ہیں اور تم دوسرے سے سوال کرتے ہو، عمر نے کہا کیا تم جواب دینے والے کی شناخت رکھتے ہو، وہ علی بن طالب ہیں۔ میں نے پیغمبر اکرمؐ سے سنا ہے کہ علی کا ایمان آسمان وزمین کے وزن سے زیادہ سنگین ہے (مجلسی، ج ۴۰ ص ۱۱۹)

خلیفہ دوم کے زمانے میں یہودی علماء کی ایک جماعت، مدینہ وارد ہوئی اور کہا ہمارے چند سوال ہیں اگر صحیح جواب دیا گیا تو ہم سمجھیں گے کہ اسلام حق ہے اور محمد خدا کے پیغمبر ہیں ورنہ اسلام باطل دین ہے۔ انھوں نے خلیفہ کے سامنے سوال پیش کیئے آسمان کا قفل کیا ہے، آسمان کی کنجی کیا ہے، کون سی قبر اپنے مردے کو کنارے لے گئی کس موجود نے اپنی قوم کو ڈرایا لیکن وہ جن وانس سے نہ تھا.....خلیفہ دوم کے پاس کوئی جواب نہ تھا سر جھکالیا اور بولے عمر کے لئے عیب نہیں کہ سوال کیا جائے اور انسان جواب نہ دے سکے۔ یہودی علماء کی جماعت یہ کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی کہ اسلام کا باطل ہونا ثابت ہوگیا۔ ہے، سلمان فارسی اس قضیہ کے شاہد تھے اغث الاسلام کا نعرہ بلند کرتے ہوئے آئے اور امام علی علیہ اسلام کے خدمت میں تمام ماجرا بیان کیا، حضرت نے رسول اکرمؐ کا لباس پہنا اور مسجد میں تشریف لائے۔ جیسے ہی عمر کی نگاہ امام پڑی کھڑے ہوئے اور کہنے لگے جب بھی کوئی مشکل پیش آئی ہے تو آپ کے پاس حاضر ہوتے ہیں امام علیہ السلام نے یہودی سے شرط کی کہ اگر جوابات تورایت سے دئے گئے تو مسلمان ہو جائیں گے۔ ان لوگوں نے بھی قبول کیا، امام نے فرمایا آسمان کا قفل شرک ہے جس کی بنا پر انسان کا عمل اوپر نہیں جاتا اور قبول نہیں ہوتا، آسمان کی کنجی کلمہ شہادتین ہے، وہ قبر جو اپنے مردے کو کنارے لے گئی وہ مچھلی ہے جو حضرت یونس کو نگل گئی تھی اور ایک مدت بعد ساحل کے کنارے اگل گئی تھی۔ وہ موجود جس نے اپنی قوم کو ڈرایا اور جن وانس سے نہیں ہے، وہ چیونٹی ہے جس نے دوسری چیونٹیوں سے کہا، اپنے سوراخوں میں چلی جاؤ کہیں سلیمان کے سپاہی تمھیں پائمال نہ کردیں۔ یہودی کے تینوں عالم ایمان لے آئے اور علی علیہ السلام کو اسلامی امت کا اعلم قرار دیا (امینی ج ۶ ص ۱۵۴)

امام علی علیہ السلام اور خلیفہ سوم

امام علی علیہ السلام کی جانب سے خلفاء کی علمی وفکری مساعدت فقط خلیفہ اول و دوم کے عصر سے مخصوص نہیں،نوخیز اسلامی معاشرے کی حفاظت اور وحدت کے لئے آپ پوری سعی وکوشش فرماتے تھے اور خلیفہ سوم کے دور میں بھی اسلام و مسلمین کی سیاسی وعلمی ضرورت کو برطرف کرتے تھے،خلیفہ سوم بھی ہمیشہ آپ کے افکار وخیالات نیز راہنمائی سے استفادہ کرتے تھے اس سلسلہ کے چند واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔

الف:۔ علمی پناہ گاہ

حضرت امام علی علیہ السلام دنیا میں اسلام کی وسعت اور اسلامی ملک کے اندر اسلامی بنیاد کی پائیداری کی فکر میں رہتے تھے۔آپ لوگوں کو اسلامی احکام ومعارف کی تعلیم کے ذریعہ نوخیز اسلام کا دفاع کرتے تھے ۔اسی لئے جب بھی خلیفہ سوم امام کی طرف دست نیاز دراز کرتے امام علی علیہ السلام ان کی کمک کرتے تھے۔ایک شخص عثمان کے پاس آیا اور ان سے ایسی دو کنیزوں سے مجامعت کے لئے سوال کیا جو آپس میں بہن ہیں عثمان نے جواب دیا،قرآن کی ایک آیت اسے جائز کہتی ہے حالانکہ دوسری آیت حرام قرار دیتی ہے۔اگر چہ میں ایسا فعل اچھا نہیں سمجھتا لیکن اس فعل کا حلال حرام پر ترجیح رکھتا ہے۔وہ شخص دربار خلافت سے باہر نکلا کہ امام سے ملاقات ہوگئی۔اس نے یہی سوال امام سے بھی پوچھا،امام نے اسے اس فعل سے منع کیا اور فرمایا،اگر حکومت ہمارے ہاتھ میں ہوتی اور تمھیں یا کسی اور شخص کو اس فعل کا مرتکب پاتا تو ضرور سزا دیتا(بیہقی،ج۷ص۱۶۴،قرطبی،ج۵ص۱۱۷سیوطی، ج۲ص۱۳۶امزمخشری،ج۱ص۵۱۸،ابن حزم ج۹ص۱۳۳،فخر رازی،ج۱۰ص۱۳۶،شیخ مفید الارشاد الباب الثانی،فصل ۶۰)

قرآن مجید کی آیت (حرمت علیکم امھاتکم و بناتکم ..... و ان تجمعوا بین الاختین) نساء۲۳ کا ظاہر ایسی دو کنیزوں سے مجامعت کو حرام قرار دیتا ہے جو آپس میں بہنیں ہوں کیوں کہ آیت کا

اطلاق وعموم، آزاد اور غلام انسان دونوں کو شامل ہے، اس بنا پر امام علی علیہ السلام نے سائل کو ارتکاب فعل کے لئے منع فرمایا اور صحابہ وفقہاء بھی اس فعل کی حرمت پر تاکید کرتے ہیں (فخر رازی ج ۱۰/ص ۳۷، سیوطی، ص ۱۳۷، قرطبی، ص ۱۱۷)

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سلسلہ میں خلیفہ سوم کا نظریہ کس بنا پر ہے زمخشری معتقد ہے کہ خلیفہ نے سورہ مومنون کی آیت ۲۳ یعنی'' **والذین هم لفروجهم حافظون الاعلى ازواجهم او ما ملكت ايمانهم** '' سے استدلال کیا ہے (زمخشری، ج ۱/ص ۵۱۸) اگر خلیفہ نے تحلیل کے لئے اس آیت سے استفادہ کیا ہو تو استدلال صحیح نہیں ہے کیوں کہ یہ آیت مومنین کی حریم عفت کو بیان کر رہی ہے، یعنی مومن شخص فقط زوجیت و کنیز کے ذریعہ جنسی ضرورت کو برطرف کرتا ہے اور یہ مطلب شروط قیود کے باوجود کہ ان دو کی عمومیت کی تخصیص کرے منافات نہیں رکھتا ہے، سورہ نساء کی آیت نمبر ۲۲ و ۲۳ '' **حرمت عليكم امهاتكم و بناتكم .... الاختين الا م قد سلف** '' ذکر شدہ آیت کے لئے مخصص ہے لہذا ان دونوں آیت کے ذریعہ یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ایسی دو کنیزیں جو آپس میں بہن ہیں ان سے مجامعت حرام ہے۔

ب:۔ امام علی علیہ السلام اور عثمان کے فیصلے

۱۔ ایک عورت نے شادی کے چھ ماہ بعد وضع حمل کیا، عثمان نے اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا، امام علی علیہ السلام نے عثمان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا ہے؟ عثمان نے کہا قرآن پڑھا ہے، امام علی علیہ السلام نے فرمایا، کیا تم نے خدا کے فرمان کو نہیں سنا کہ خدا فرماتا ہے: '' **حمله و فصله ثلاثون شهرا** '' (احقاف/۱۵) اور دوسری جگہ فرماتا ہے '' **حولين كاملين** '' (بقرہ/۲۲۳) لہذا حمل کی مدت چھ ماہ بھی ہو سکتی ہے، عثمان نے کہا خدا کی قسم میں اب تک اس حقیقت سے آگاہ نہ تھا (بیہقی، ج ۱۱/ص ۴۲۸) البتہ اہل سنت کے بعض علماء نے اس قضیہ کو تھوڑا فرق کے ساتھ، خلیفہ دوم وسوم دونوں کی طرف نسبت دی ہے۔

۲۔ اسلام میں عورت کے حقوق میں سے ایک یہ ہے کہ اگر ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے اور عورت طلاق کے عدہ میں ہے اگر مرد عورت کے عدہ طلاق ختم ہونے سے قبل مر جائے تو عورت بھی دوسرے ورثہ کی طرح ارث کا حق رکھتی ہے کیوں کہ جب تک عورت کا عدہ ختم نہ ہو بیوی و شوہر کا رشتہ باقی ہے۔ عثمان کی خلافت کے دور میں ایک شخص کے عقد میں دو عورتیں تھیں ایک انصار دوسری بنی ہاشم سے تعلق رکھتی تھیں اس شخص نے انصار والی عورت کو طلاق دے دی اور تھوڑے عرصے بعد وفات پا گیا، انصاری عورت خلیفہ کے پاس گئی اور کہا میرا عدہ ختم نہیں ہوا ہے، میں وراثت میں اپنے حصہ کی خواہاں ہوں۔ عثمان فیصلہ نہ کر سکے قضیہ کو امام علی علیہ السلام سے عرض کیا، حضرت نے فرمایا: اگر انصاری عورت قسم کھائے کہ اس نے شوہر کے انتقال کے بعد تین مرتبہ حیض نہیں دیکھا ہے تو وہ شوہر کے ترکہ سے ارث لے سکتی ہے، عثمان نے دوسری عورت سے جو ہاشمی تھی کہا یہ فیصلہ تمھارے پسر عم علی علیہ السلام کا ہے، میں اس سلسلہ میں کوئی نظریہ نہیں رکھتا ہوں۔ اس ہاشمی عورت نے کہا میں علی علیہ السلام کی قضاوت پر راضی ہوں وہ قسم یاد کرے اور میراث کو لے لے۔ (نوری طبرسی، ج ۷، ص ۲۰۰، ح ۲۱۴۵)

ج:۔ امام علی علیہ السلام اور خلیفہ سے ناراض جماعت

امام علی علیہ السلام تین حاکم سے تین مختلف عصر میں روبرو تھے کہ ہر ایک کے لئے اسی اعتبار سے مختلف موقف کی ضرورت تھی۔ خلیفہ اول و دوم کے عصر میں افراد نسبتا ارام و راضی تھے لیکن خلیفہ سوم کے زمانہ میں لوگ موجودہ حالات سے عاجز آ گئے تھے اور تحمل نہیں کر پا رہے تھے۔

ا۔ وساطت اور میان جگیری

امام علی علیہ السلام نے خلیفہ سوم اور مخالفین کے درمیان وساطت کی اور اصلاحی موقف اختیار کیا، اس کا مفہوم یہ نہیں کہ آپ خلیفہ کے افعال سے راضی تھے یا آپ ان کا دفاع کر رہے تھے، بلکہ حضرت کی کوشش یہ تھی کہ آپ کی وساطت سے اسلامی معاشرے سے فتنہ و آشوب ختم ہو جائے۔ جس وقت مصر کے ناراض مسلمانوں نے

پہلی مرتبہ خلیفہ سوم کے گھر کا محاصرہ کیا، تو خلیفہ نے جو اس سے قبل امام کی وساطت سے ناراض افراد کے قہر سے نجات پا چکے تھے، ایک فرد کو امام علی علیہ السلام کے پاس بھیجا اور اپنے قتل کے احتمال کو پیش کرتے ہوئے امام سے درخواست کی کہ آپ ناراض مسلمانوں سے گفتگو کریں نیز خلیفہ کی جانب سے ان کے مطالبات کو قبول اور عمل کرنے کا وعدہ دیتے ہوئے، انھیں محاصرہ اٹھا لینے پر راضی کریں، امام علی علیہ السلام ناراض جماعت کے درمیان حاضر ہوئے اور خلیفہ کے قول وعہد کو پیش کیا، ناراض جماعت نے بھی خلیفہ کو اصلاح امور کے لئے تین دن کی مہلت دیتے ہوئے تحریری عہد نامہ کی شرط پر خلیفہ کے گھر کا محاصرہ ختم کر دیا (طبری ج ۳، ص ۳۹۴، ح ۳۷۷)

۲۔ پانی کا بھیجنا

جس وقت انقلابیوں نے عثمان کے گھر کا محاصرہ کر رکھا تھا اور امام علی علیہ السلام کی کوششیں خلیفہ کی عہد شکنی کی بنا ثمر بخش نہ ہوئیں تو محاصرہ کرنے والے اشخاص سنجیدگی کے ساتھ مروان کو حوالے کئے جانے کا مطالبہ کرنے لگے اور خلیفہ کی برطرفی کے خواہاں ہوئے لیکن خلیفہ مروان کو قتل کر دیئے جانے کے خوف سے حوالے کرنے سے انکار کر رہے تھے اور اپنی برطرفی پر بھی حاضر نہ تھے، عثمان نے اس مرتبہ بھی امام علی علیہ السلام کو پیغام بھیجا یہ قوم مجھے قتل کر ڈالے گی اور انھوں نے پانی بھی بند کر دیا ہے۔ آپ سے پانی کی خواہش کی۔ (بلاذری، ج ۵، ص ۶۹ و ۶۸) امام علی علیہ السلام نے اپنے فرزند حسن وحسین علیہما السلام کے ذریعہ خلیفہ کے لئے پانی کی مشک بھیجی محاصرہ کرنے والوں نے فرزند علیؑ کے احترام میں پانی کی مشک جانے دی خلیفہ نے امام علی علیہ السلام کے لئے ایک شعر بھیجا، **فان کنت ما کولا فکن انت اکلی**۔۔۔ اگر قرار ہے کہ میں کھاؤں تو آپ میرے کھلانے والے ہوں، ورنہ مجھے نجات دیں۔ (ابن خلدون، ج ۲، ص ۱۰۴۷)

۳۔ قتل خلیفہ کے لئے مانع ہونا

جس وقت امام علی علیہ السلام کو خبر ملی کہ لوگ قتل خلیفہ کے لئے مصمم ہیں تو حضرت نے اپنے فرزند حسن و

حسین علیہما السلام کو حکم دیا کہ اپنی تلواروں کو اٹھالیں، منزل خلیفہ کے دروازہ پر کھڑے ہو جائیں اور کسی کو خلیفہ تک نہ پہنچنے دیں (سیوطی، ص/۱۵۹، بلاذری، ج/۶ص/۱۸۵) امام حسن وحسین علیہما السلام نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور حملہ آوروں سے جنگ کی۔ حتیٰ امام حسن علیہ السلام کا چہرہ اور سر خون آلود ہو گئے اور امام علیہ السلام کے غلام قنبر کا سر شدید مجروح ہو گیا (سیوطی، ص/۱۶۰، علی بن الحسین سعودی، ج/۲ص/۳۴۱)

۴۔ خلیفہ سوم کی تدفین

جس وقت امام علی علیہ السلام کو قتل عثمان کی خبر ملی حضرت تیزی سے خلیفہ کی منزل کو پہنچے اور محافظین منزل و امام حسن وحسین علیہما السلام پر اعتراض کیا، آخر کار آپ کی وساطت اور خدمت وعظمت کی بناء پر انقلابیوں نے خلیفہ کے دفن کی اجازت دے دی امام علیہ السلام نے چند صحابہ کے ہمراہ خلیفہ سوم کو سپرد خاک کر دیا (ابن اعثم کوفی، ج/۲ ص/۲۴۲، طبری، ج/۳ص/۴۳۸)

نتیجہ

پیغمبر اسلامؐ کی وفات اور سقیفہ کے مسئلہ سے سوء استفادہ کرتے ہوئے بعض موقع پرست اسلامی امت میں اختلاف برپا کرنے کے لئے آپ کی بیعت کرنا چاہتے تھے امام علیہ السلام نے انکار کرتے ہوئے انھیں مایوس کر دیا اور امت اسلامی کے اتحاد اور برتر مصالح کی خاطر سکوت اختیار کیا اور اسلامی اتحاد کے لئے خلفاء کی مساعدت و مدد کی۔

علی علیہ السلام نے ۲۵ سالہ سکوت اور خاموشی کے عصر میں اپنے الٰہی وانسانی وظائف کو عسکری، سیاسی، علمی، قضائی واقتصادی... مشوروں کے قالب میں پیش کیا تا کہ نوخیز اسلامی معاشرہ پائے دار ہو اور دین کی حفاظت کی جا سکے۔ آپ کے لئے مختلف مشکلات کے مقابل جو اسلام اور اسلامی امت کو دامن گیر تھی اور جس نے مسلمانوں کی حیات و دین کی بقا کو خطرہ میں ڈال دیا تھا، بے توجہ رہنا ممکن نہ سمجھا کہ آپ کا حق غصب کر لیا گیا تھا البتہ خلفاء کے

لئے آپ کی مساعدت اس نوعیت کی تھی کہ خلفاء سوء استفادہ نہ کرسکیں اور اپنی خلافت کے لئے جواز و مشروعیت کسب نہ کرسکیں۔

علی علیہ السلام تین دور میں تین مختلف افراد کے مقابل تھے کہ ہر ایک دور اپنے لئے خاص موقف کا حامل تھا۔ اسی بنا پر امام علی علیہ السلام خلیفہ سوم کے عصر میں علمی و قضائی مرجع کے عنوان سے مورد مشورت قرار پانے کے علاوہ خلیفہ سے ناراض گروہ کے مقابل بھی مصالحت کے عہدہ دار تھے اور خلیفہ کی منزل کے محاصرہ اور ان پر پانی بند ہونے کے وقت ان تک پانی پہنچوایا اور اپنے فرزندوں کو ان کی حفاظت کے لئے دروازۂ منزل پر مقرر کیا نیز امام علی علیہ السلام نے خلیفہ کی تدفین بھی انجام دی۔

منابع و مآخذ

۱۔ محمد بن یعقوب کلینی، اصول کافی، دار التعارف طبع چہارم

۲۔ محمد ابی یعلی الفراء، الاحکام السلطانیہ، ایران سازمان تبلیغات اسلامی ۱۴۰۶ھ

۳۔ خواجہ احمد بن محمد بن اعثم کوفی الفتوح، ھند حیدر آباد دکن دایرۃ المعارف العثمانیہ، الطبعۃ الاولی، ۱۳۸۸ھ ھمو، بیروت دار الکتب العلمیہ

۴۔ محمد بن النعمان مفید، الارشاد، قم انتشارات بصیرتی۔

۵۔ محمد بن الحسن بن درید ازدی بصری، المجتبیٰ، دوم ہند، حیدر آباد ۱۳۶۲ھ

۶۔ مجد الدین بن الاثیر، النھایۃ فی غریب الحدیث والاثر، تحقیق طاہر احمد زاوی و محمود محمد طناحی، موسسہ اسماعلیان، قم ۱۳۶۴ ش ق۔

۷۔ عبد الملک ابن ہشام، السیر ۃ النبویہ، چاپ عمر عبد السلام تدمری، بریوت، ۱۴۰۹/۱۹۸۹۔

۸۔ علی بن اثیر جزری، الکامل فی التاریخ، بیروت ۱۴۰۹/۱۹۸۹

۹۔ محمد بن سعد، الطبقات الکبری، بیروت، دار صادر

۰۱۔ شریف رضی، الخصایص الائمہ خصائص امیر المومنینؑ، تحقیق، الدکتور محمد ھادی امینی، مشھد، موسسہ طبع و النشر استانہ الرضویۃ المقدسہ ۱۴۰۶ھ

۱۱۔ احمد بن حسینی بیھقی، السنن الکبری، اول، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۹ھ

۱۲۔ عبد الحسین امینی، الغدیر، تہران، ۱۳۷۱ش

۱۳۔ سید محسن امین، اعیان الشیعہ، چاپ حسن امین بیروت، ۱۹۸۶ء/۱۴۰۶ھ

۱۴۔ طاہر بن مطہر مقدس، البدؤ التاریخ، مکتبہ الاسلامیہ ۱۹۶۲ء

۱۵۔ حاکم نیشاپوری، المستدرک علی الصحیحین، تلخیص، ریاض، مکتبۃ النصر الحدیث

۱۶۔ شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان ذہبی، العبر فی خبر من عبر، تحقیق فؤاد سعید کویت، دار الکتب ۱۹۶۱ء

۱۷۔ ابو حنیفہ احمد بن داؤد دینوری، الاخبار الطّوال، طبع بنفقۃ المکتبۃ العربیہ، نعمان الاعظمی، بغداد (بی تا)

۱۸۔ محمود زمخشری، الکشاف، بیروت، ۱۴۷ھ

۱۹۔ جلال الدین سیوطی، الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور، قم، ۱۴۰۴ھ

۲۰۔ محمد بن احمد قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، بیروت ۱۹۸۵ء/۱۴۰۵ھ

۲۱۔ محمد ابن عمر فخر رازی، التفسیر الکبیر، بیروت، دار احیاء التراث العربی۔

۲۲۔ یوسف بن عبد البر قرطبی مالکی، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، بیروت ۱۳۲۸ق

۲۳۔ احمد بن یحی بن بلاذری، انساب الاشراف، حققہ، محمد باقر المحمودی، لبنان، منشورات موسسہ الاعلمی للمطبوعات، ۱۹۷۴ء

۲۴۔ ابو زید عبد الرحمان بن محمد بن خلدون، العبر و دیوان المبتدا و الخبر فی ایام العرب ۔۔۔ بیروت، دار کتب

اللبنانی،۱۹۵۶ء۱۰۶۱ق

۲۵۔ عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ، الامامہ والسیاسہ، اول، قم، شریف رضی، ۱۳۶۳ش

۲۶۔ احمد بن عبدربہ اندلسی، العقد الفرید، بیروت، ۱۴۰۹ق/۱۹۸۹ء

۲۷۔ ابن کثیر القرشی الدمشقی الشافعی، البدایہ والنہایہ فی التاریخ، مصر، مطبعۃ السعادہ، ۱۳۵۱ش

۲۸۔ محمد باقر مجلسی، بحارالانوار، تہران، ۱۳۶۲ش

۲۹۔ نصیرالدین عبدالجلیل قزوینی رازی، بعض مثالب النواصب فی نقض بعض فضائح الروافض، سید جلال الدین، محدث، ۱۳۷۱ش

۳۰۔ محمد بن جریر بن یزید طبری، تاریخ الامم والملوک، تاریخ طری، بیروت، چاپ محمد ابوالفضل ابراہیم، دارالتراث۔

۳۱۔ کلاعی البلنسی وھذ بہ خورشید احمد فارق، تاریخ الردہ، اقتبسہ من الاکتفا، معھد الدراسات الاسلامیہ، ھند، ۱۹۲۰ء

۳۲۔ عبدالرحمان بن جوزی، تاریخ عمر بن خطاب، قدم لہ وعلق علیہ عبدالکریم الزماعی، دمشق۔

۳۳۔ غزالی، احیاء علوم الدین، دوم، بیروت، ۱۴۰۵ق/۱۹۸۵ء۔

۳۴۔ عبدالرحمٰن ابن خلدون، تاریخ ابن خلدون، بیروت، ۱۳۹۱/۱۰۷۱۔

۳۵۔ یوسف ابن جوزی تذکرہ الخواص، تہران، کتابخانہ نینوا۔

۳۶۔ احمد ابن یعقوب یعقوبی، تاریخ یعقوبی، بیروت، دار صادر، ۱۳۷۹ھ، ترجمہ ابراہیم آیتی، شرکت انتشارات علمی وفرہنگی، تہران، ۱۳۷۸ش۔

۳۷۔ جلال الدین سیوطی، تاریخ خلفاء مصر، مطبعۃ السعادہ، ۱۳۷۱ق۔

۳۸۔ علی بن حسن بن عساکر، تاریخ مدینہ، دمشق مجمع الغۃ العربیہ، ۱۳۹۸ق

۳۹۔ محمد بن حسن طوسی، تہذیب الاحکام تصحیح وتعلیق علی اکبر غفاری، اول، نشر صدوق، تہران، ۱۴۱۷ق۔

۴۰۔ احمد بن عبداللہ طبری، ذخائر العقبی فی مناقب ذوی القربی، قاہرہ، ۱۳۵۶ق۔

۴۱۔ ازدی بصری، فتوح الشام، صححہ ویلیام ناسولیس ایرلندی، طبع فی کلکتہ، ۱۸۵۴ق۔

۴۲۔ محمد معین، فرہنگ معین، چہارم، ۱۳۶۰ش۔

۴۳۔ خلیل جر، سید حمید طبیبیان، فرہنگ لاروس، موسسہ انتشارات امیر کبیر، تہران، ۱۳۶۷ش۔

۴۴۔ جعفر سبحانی، فروغ ولایت، قم موسسہ امام صادق علیہ السلام ۱۳۷۶ش۔

۴۵۔ واقدی، فتوح الشام، الطبع الثانیہ، بالمطبع العثمانیہ، شیخ عثمان عبدالرزاق، ۱۳۰۴ق۔

۴۶۔ یحیٰ بن جابر بلاذری، فتوح البلدان، تعلیق رضوان، محمد رضوان، مصر، المطبعہ المصریہ بالازہر، الطبعہ الاولی ۱۳۵۰/۱۳۱۹ق۔

۴۷۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ قم، چاپ محمد ابوالفضل ابراہیم ۱۴۰۴ق

۴۸۔ مرتضی عالمی، فصل نامہ مطالعات تاریخی، سال اول، ش ۳، ۱۳۶۸ش

۴۹۔ متقی ہندی، کنزالعمال، بیروت، ۱۴۰۹ق/۱۹۸۹م۔

۵۰۔ محمد رواس قلعہ چی، موسوعۃ فقہ علی بن ابی طالب علیہ السلام، اول، دارالنفائیس، بیروت، ۱۴۱۷ق۔

۵۱۔ محمد بن نعمان، مفید، مصنفات، قم ۱۴۱۳ق۔

۵۲۔ ابوالحسن علی بن الحسین مسعودی، مروج الذہب، مصر، مطبعہ البہیۃ المصریۃ، ادارۃ الملتزم ۱۳۴۶ق۔

۵۳۔ جعفر سبحانی ، مبانی حکومت اسلامی ، ترجمہ و نگارش داوود الھامی ، موسسہ علمی و فرہنگی سید الشہدا ، ۱۳۷۰ش۔

۵۴۔ میرزا حسین النوری الطبرسی ، مستدرک الوسائل ، موسسہ ال البیت علیہ السلام ، لا حیاء التراث ، ۱۴۰۷ق۔

۵۵۔ فخرالدین طریحی، مجموع البحرین،

۵۶۔ عبدہ، صبحی صالح، نہج البلاغہ

۵۷۔ وحدت جوامع در نہج البلاغہ، برگرفتہ از آثار آیۃ اللہ جوادی آملی ،سعید بندعلی ،مرکز نشر اسراء، اول ، ۱۳۸۰ش۔

فقہی اجتہاد اور اسلامی مذاہب کی تقریب میں اس کا اثر

نگارش: ڈاکٹر عبدالستار ابراہیم الہیتی (بحرین یونیورسٹی کے شعبہ اسلامی دروس کے استاد)

ترجمہ: نور محمد ثالثی

ڈاکٹر عبدالستار ابراہیم الہیتی جیت علماء اہل سنت میں سے ہیں انھوں نے اجتہاد کی اہمیت اور امت اسلامیہ کے درمیان اس کے مثبت اثرات مثلا اتحاد بین المسلمین اور خاص طور سے مختلف مسالک اسلامی کے علماء کے اجتہاد کے ذریعہ ہم فکر اور ہم خیال ہونے کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے اور اس کی ضرورت پر بھر پور زور دیا ہے۔ مقالہ کی اہمیت کی پیش نظر ہم اسے قارئین کی نذر کرتے ہیں۔

خلاصہ

قرآن مجید اور سنت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فقہی فروعات میں نظریہ قائم کرنے کے لئے تمام اسلامی مذاہب کے نزدیک دو مسلم ومتفق علیہ بنیادی منبع و مدرک ہیں اس کے باوجود فقہاء کی جانب سے مختلف فتاویٰ اور گونا گوں نظریات پیش ہوتے

رہتے ہیں۔

چونکہ اجتہاد ہر زمانہ میں اپنا خاص تقاضا رکھتا ہے اور ہر دور کے فقہاء قرآن اور سنت سے استفادہ کرتے ہوئے مختلف آراء ونظریات پیش کرتے ہیں اس لئے مقالہ نگار یہ یاددہانی کرانا چاہتا ہے کہ وحی الٰہی اور بشری تفکر کے درمیان فرق کا قائل ہونا چاہئے اور اختلاف آراء وہ مبارک وجود ہے جسے انسانی تفکرات میں قبول کیا گیا ہے اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک حدیث(اختلاف امتی رحمة) نے اس اختلاف کو ''رحمت'' سے تعبیر کیا ہے۔

مقالہ نگار آخرکار اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اسلامی مذاہب میں سے ہر ایک مذہب و مسلک کو چاہئے کہ دوسرے مذہب ومسلک کے آراء ونظریات کے مقابلہ میں نرمی کا ثبوت دیں تاکہ فقہی فروعات میں اجتہاد اور اختلاف آراء کو خود بھی مذاہب کی تقریب کا ایک راستہ شمار کیا جائے نہ یہ کہ ہر مذہب ومسلک اپنے کو حق بجانب سمجھ کر اسی پر اصرار کرے اور دوسرے مذاہب ومسالک کی تکفیر وتنگ نظری کا زمینہ فراہم کرے اور نتیجہ میں مذاہب کے درمیان تفرقہ عمیق سے عمیق تر ہوجائے۔

کلیدی الفاظ: اجتہاد، فقہی مذاہب، تقریب، اختلاف، تفرقہ، سنت...

مقدمہ

ساری کائنات کے خالق خدا کا شکر اور اولین وآخرین کے مولیٰ وآقا ہمارے سید وسردار حضرت رسول خداؐ پر درود وسلام۔ خداوند متعال کی ایک رحمت ومہربانی یہ ہے کہ اس نے اس امت کے فرزندوں کو چراغ ہدایت اور کشتی نجات قرار دیا ہے تاکہ وہ امت کے لئے رہنما اور کامیابی وکامرانی کی راہ دکھانے والے بن جائیں قرآن

مجید کی تفسیر کریں، سنت کی ان کے واسطے تشریح کریں اور قرآنی آیات اور احادیث شریفہ سے ان کے لئے شرعی احکام کو استنباط کریں اس لئے مختلف فقہی مذاہب ومسالک اسلامی وجود میں آ گئے کہ جن میں سے ہر ایک مذہب کے آئین وقوانین جدا اور ہر مکتب فکر کے مجتہد اور اسلوب عمل مختلف ہو گئے لیکن سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مقصد ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے شریعت الٰہیہ اور اس کے احکام کو اجراء کرنے کے لئے مسلمانوں کے سامنے صحیح ترین حکم کو حاصل کرنے کی حتی الامکان سعی وکوشش۔ قانون بنانے والا ایک ہی ہے اور وہ ہے ذات خداوند متعال، منبع ومدرک بھی ایک ہی ہے اور وہ ہے وحی یعنی قرآن وسنت اور تبلیغ کرنے والا بھی ایک ہے اور وہ ہے حضرت محمد مصطفیٰ کی ذات گرامی اس سلسلہ میں امام بصیری نے کیا خوب فرمایا ہے:

وکلهم من رسول الله ملتمس

غرفا من البحر او رشفا من الديم

''ہر شخص حضرت رسول خداؐ کے در کا سوالی ہے چاہے سمندر سے ایک گھونٹ کا خواہاں ہو یا باران (رحمت) سے اپنی پیاس بجھانا چاہ رہا ہو''۔

اس شرعی اجتہاد اور اپنے مختلف آراء ونظریات کے ساتھ فقہی مکاتب فکر نے ہمارے لئے ایک عظیم اور گرانبہا فقہی ثروت، میراث کے بطور چھوڑی ہے، جس کے اوپر امت مسلمہ کو فخر ومباہات کرنا چاہئے اور اپنے علماء وفقہاء کی قدر کرنا چاہئے اسی واسطے ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک دوسرے سے قریب ہونے کے لئے بالکل ویسے ہی راہ اپنائیں جس طرح ان مذاہب کے وجود پذیر ہونے میں اسی مطلب کو مدنظر رکھا گیا ہے نہ کہ جھگڑا اور ٹکراؤ کا راستہ، جسے مذاہب ومسالک کے کچھ نادان پیروکار اسے عملی کرنا چاہتے ہیں، تاکہ فقہی اجتہاد کو اپنے لئے ایک قوت وطاقت کا منبع اور افراد امت کے درمیان اپنے لئے فخر ومباہات کا میدان بنالیں۔

اس مقصد کا حصول صرف اس حقیقت کے ادراک پر منحصر ہے کہ تمام اسلامی مذاہب اور تمام اسلامی

مسالک کے پیروکار یہ باور کرلیں کہ فقہی اجتہاد درحقیقت اسلامی یکجہتی اور اتحاد کے دروازوں میں سے ایک در ہے نہ کہ تفرقہ واختلافات کا ایک روشندان۔

مذکورہ بالا مطالب کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اس موضوع کو ''فقہی اجتہاد اور اسلامی مذاہب کی تقریب'' کے عنوان سے انتخاب کر کے اس کے اوپر چار زاویۂ نظر سے بحث وگفتگو کریں گے۔

الف: فقہی اجتہاد کی حقیقت اور اس کی اہمیت۔

ب: الٰہی وحی اور بشری تفکر۔

ج: فقہی مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان موجود رابطہ۔

د: فقہی اجتہاد، تقریب کا ایک راستہ نہ کہ تفرقہ اور ٹکراؤ کا۔

مجھے بہت امید ہے کہ میں اس موضوع کو کما حقہ پیش کرسکوں اور اس کی شرعی اہمیت پر توجہ رکھتے ہوئے ان تمام مطالب کی تحقیق کروں ہمارا مقصد، خوشنودی الٰہی کا حصول ہے۔

الف: فقہی اجتہاد کی حقیقت واہمیت

علماء اصول فرماتے ہیں: اجتہاد، شرعی احکام کو شرعی دلیلوں میں سے کسی ایک دلیل سے استنباط کرنے کے لئے کی گئی سعی وکوشش کو کہتے ہیں۔(ابوزہرہ، ۱۳۷۷: ۳۵۶، ۱۴۰۸: ۲۲۲ وزیدان، ۱۴۰۵: ۴۰۱)۔

اگر اجتہاد، کسی امر میں حکم خداوندی کی شناخت کے لئے ان اصول وضوابط کی روشنی میں جنھیں علمائے امت نے مقرر ومعین فرمایا ہے، کی جانے والی کوشش کو کہتے تو پھر ہر مسلمان کو چاہئے کہ اپنے خدا کے درمیان تعامل و ارتباط کے لئے اسی کو توشۂ راہ قرار دے کر واجبات پر کاربند ہو اور محرمات سے پرہیز کرے۔

لیکن چونکہ انسانوں کے اندر مطلب کے استنباط اور درک کی روشوں میں اختلاف اور فکری صلاحیتوں میں تفاوت پایا جاتا ہے اور ان کے درمیان ذہنی وعلمی نشیب وفراز نیز دنیوی مشاغل اس عمل کو انجام دینے میں

رکاوٹ پیدا کرتے ہیں لہذا خدائے رحیم کی رحمت اپنے بندوں کو شامل حال ہوئی اور اس نے انسانوں کو اجازت دیدی کہ تم میں سے جو لوگ اس کام کو انجام دینے کی توانائی رکھتے ہیں ان کی پیروی کرو ارشاد قدرت ہوتا ہے (**فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون**)(نحل/۴۳)۔ اگر تم نہیں جانتے ہو تو اہل ذکر اور جاننے والوں سے سوال کرو۔ اور اس طرح اجتہاد کا عمل لوگوں کے لئے ایک واجب کفائی عمل ہو گیا اس معنی میں کہ اگر کچھ لوگ جو اس کام کو انجام دینے کی ایک حد تک توانائی رکھتے ہیں جس سے احکام دین کے سمجھنے میں لوگوں کی بصیرت بھر ضرورت رفع ہو سکے تو پھر ایسی صورت میں دوسرے لوگوں سے اجتہاد کا وجوب ختم ہو جائے گا۔

اگر چہ اجتہاد ہر زمان و مکان میں شریعت الٰہیہ کی شناخت کے لئے لازم و واجب رہا ہے اور خداوند متعال نے اجتہاد و قانون گزاری کے واسطے کتاب وسنت کو دو بنیادی منبع قرار دیا ہے لیکن ہمارے زمانے میں اس کی ضرورت دوسرے زمانوں کی بہ نسبت شدید ہے اور یہ ضرورت تازہ مسائل، بڑے اور نئے حادثات کے حوالے سے جن کے بارے میں قرآن مجید اور احادیث نبوی میں اشارہ نہیں کیا گیا ہے قرآن وحدیث سے ان کے فقہی احکام کے اور جدید مسائل کے حل وفصل کے لئے ایک نئے منصوبہ کی خواہاں ہے۔

مذکورہ مسائل کے پیش نظر ہر دور میں علماء ومجتہدین کا وجود ضروری ہے کیونکہ ہر دور کے اپنے نئے مسائل ہوتے ہیں کہ جن کا وجود گزشتہ ادوار میں نہ تھا اور مسلمین کو اس بات کی ضرورت ہے کہ ان مسائل کے سلسلہ میں حکم خدا معلوم کریں۔ ظاہر سی بات ہے کہ ان احکام ومسائل پر دسترسی کا راستہ وہی اجتہاد واستنباط اور عقل کا استعمال ہے اسی لئے اگر کسی زمانے میں مجتہد نہ ہوں کہ جو احکام اسلامی وشریعت کے قوانین پر اپنی ساری توانائی صرف کرتے ہیں تو اس وقت تمام مسلمان کوتاہی کرنے کے جرم میں گرفتار ہوں گے اور اس جرم ومعصیت کا ازالہ تبھی ممکن ہے جبکہ علمائے مجتہدین کا یہ گروہ میدان میں حاضر ہو احکام کو ان کے منابع ومدارک سے استنباط واجتہاد کر سکے تاکہ یہ ذمہ داری ان سب کے کاندھوں سے اٹھ جائے۔

اس کے باوجود کہ راہ خدا میں جہاد کرنے کو خدا نے اپنے بندوں پر عائد کردہ مہم ترین فریضہ قرار دیا ہے اور اس نے انھیں اس کام کے انجام دینے کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور اسے دین میں عظیم ترین مرتبہ عطا کیا ہے پھر بھی خدا نے چند لوگوں کو یہ اجازت دے رکھی ہے کہ جہاد پر نہ جا کر دین میں تفقہ اور احکام دین کو کتاب خدا اور سنت پیامبرؐ سے استنباط کریں ارشاد ہوتا ہے: **وما كان المومنون لينفروا كافة فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين** (توبہ۱۲۲)۔ مناسب نہیں ہے کہ تمام مومنین جنگ کے لئے نکل پڑیں پس کیوں نہیں کچھ ان میں سے دین میں تفقہ کرتے۔ اس میں کوئی شک وشبہہ نہیں ہے کہ یہ مسئلہ واضح ترین دلیل ہے اس مطلب پر کہ اجتہاد اور دین میں تفقہ جہاد کے مانند مسلمانوں پر واجب ہے لیکن کفائی وجوب کا پہلو رکھتا ہے اس معنی میں کہ چند لوگوں کو چاہئے کہ اس کام کا اقدام کریں تا کہ عوام الناس کے لئے فقہی مسائل کے جواب دینے کا مرجع و ماوی قرار پائیں۔

اجتہاد کا موضوع، قرآن یا سنت پیغمبرؐ ہے اور انھیں سے مربوط و متعلق ہے کیونکہ کسی مسئلہ میں اجتہاد کا مطلب ہے مدنظر متن کی صحت واضح ہونا یا اس کی دلالت و معنی کا آشکار ہونا یا دوسری صورت میں متن کے عام یا خاص ہونے مطلق یا مقید ہونے یا تاویل کے قابل ہونے یا علت حکم بن سکنے کے سلسلہ میں گفتگو ہوتی ہے۔

شافعی اس سلسلہ میں کہتے ہیں: ''کسی شخص کو کسی صورت یہ حق حاصل نہیں ہے کہ کسی چیز کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں اظہار خیال کرے مگر یہ کہ اسے علم ہو کہ جس کا سرچشمہ کتاب خدا قرآن سنت پیغمبرؐ اجماع یا قیاس ہو'' (الشافعی، ۱۳۵۸: ۳۹)۔ اور واضح ہے کہ اجماع اور قیاس میں سے ہر ایک متن کے آثار میں سے ایک ہیں اور ان کی تکیہ گاہ اور استواری و پائیداری متن پر موقوف ہے۔

اس لئے انسانی افکار کے لئے جائز نہیں ہے کہ متن اور اس سے اجتہاد کی بنیاد پر حاصل ہونے والے مفاہیم کے حدود کے باہر قدم رکھے کیونکہ خطا کی صورت میں حکم شریعت باطل ہو جائے گا اور اس کی عظمت وحرمت

ختم ہوکر رہ جائے گی۔ شاطبی نے اس امر کی بڑی دقیق اور مہارت آمیز وضاحت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ عقل انسانی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وحی اور متن سے آگے قدم بڑھائے اور اگر عقل کے لئے یہ جائز ہوتا تو ایسی صورت میں عقل نقل کے مأخذ یعنی متفق کو بھی باطل قرار دے دیتی اور شریعت کا ابطال بھی عقل کے ذریعہ جائز ہو جاتا اور ایسا محال ہے۔

اس بات کی وضاحت یہ ہے کہ: شریعت سے مراد مسلمانوں، مکلفوں کو خدا اور سولؐ سے نقل ہوئے احکام و دساتیر کے حدود میں محدود کرنا ہے اور انسانوں کے عقائد و کردار و گفتار کی ایک حد معین کی ہے اب ایسی صورت میں اگر عقل کے لئے یہ جائز اور ممکن ہو کہ وہ ان حدود میں سے کسی ایک حد کو توڑ سکتی ہے یا اسے نظر انداز کر سکتی تو پھر ہر قسم کے حدود و قیود کو توڑنا عقل کے لئے جائز ہو جائے گا کیونکہ جو چیز ایک مسئلہ کے لئے ثابت ہو جائے دوسرے مسائل کے لئے بھی ثابت ہو جائے گی...اور اس چیز کو کوئی بھی جائز تسلیم نہیں کرتا (شاطبی، بغیر تا ۱/ ۸۸)۔ اسی سلسلہ میں شیخ خضری ایک نکتہ کی یاد دہانی کرتے ہیں کہ مجتہد کو چاہئے کہ احکام کے اسباب و علل کو خاص و عام متون و نصوص سے استنباط کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اسے شریعت اسلامی کے کلی اصول و ضوابط سے آگاہ ہونا چاہئے تاکہ اسباب و علل کی یہ معرفت اس کے لئے جزئی مسائل کے استنباط میں دو شاہد عادل کی حیثیت رکھیں (الخضری بیک، ۱۴۰۵: ۳۶۸)۔

بے شک اب تک کے اسلامی مجتہدین، جن میں سابق علماء شامل ہیں، نے کتاب خدا و سنت رسولؐ کے برخلاف کوئی مطلب بیان نہیں کیا ہے اور وہ لوگ دوسروں سے زیادہ اس امر کی طرف متوجہ اور اس سے بچتے رہے ہیں، یہاں تک کہ جان بوجھ کر احکام الٰہی کے استنباط میں اختلاف نہیں کرتے، اور اختلاف کے ظہور کی صورت میں کوئی کسی کے موافق نظریہ یا مخالف نظریہ کے احترام میں اپنی رائے نہیں بدلتا، اسی لئے اگر گزشتہ مجتہدین اور پیشواؤں کے یہاں اسلامی شریعت کے مقاصد کی تحقیق اور حق تک رسائی میں روش اور طرز عمل کا اختلاف ہوا ہے تو

یہ اختلاف کتاب خدا قرآن اور سنت کے درک وفہم میں اختلاف کی وجہ سے وجود میں آیا ہے۔ بالخصوص ان ابواب میں، جن میں اجتہاد واستدلال کا احتمال زیادہ پایا جاتا ہے اور یہ اختلافات بھی دوسرے کی رائے کی مخالفت یا اس کو باطل وغلط ثابت کرنے کی نیت سے نہیں رہے ہیں اسی لئے ضوابط سے استناد اور فہم ودرک میں اختلاف کبھی وحدت مسلمین کے اندر شگاف ڈالنے یا ان کے درمیان جھگڑے کا باعث نہیں بنا، کیونکہ وہ حق کی تلاش، حقیقت کی جستجو سے مربوط رہا ہے اور عمداً کسی کی مخالفت مدنظر نہیں رہی ہے۔

اس طرح امت کے درمیان اجتہاد کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے اور یہ اجتہاد ایک ایسی دائمی حرکت و جاودانہ تحریک ہے کہ جو مسلمانوں کو ان کی زندگی میں پیش آنے والے نت نئے مسائل کے سلسلہ میں احکام اسلامی کا پتا دیتی ہے اس طرح اسلامی فقہ جمود کا شکار نہیں ہو سکتی اور موجودہ حوادث میں منحصر نہیں رہے گی بلکہ عوام کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے شرعی وفقہی اصولوں پر چل کر آگے ہی بڑھتی رہے گی۔

وحی الٰہی اور فکر بشری

اسلامی قوانین بنانے کے سلسلہ میں وحی الٰہی اور فکر بشری کا آپس میں تلازم ہونا ہمارے سامنے کچھ مسائل پیش کرتا ہے کہ جن پر توجہ ضروری ہے اور اس سلسلہ میں ابھرنے والے سوالات کا جواب دینا ضروری ہے۔

یہ سوال وجواب کچھ اس طرح ہیں:

کیا فکر بشری (اجتہاد) اسلامی قانون سازی میں وحی الٰہی کی جگہ لے سکتی ہے یا اس کی اپنی الگ منزل ہے؟ مزید باریکی سے کہا جائے کہ کیا فکر بشری کو وحی کا وہ تقدس اور عصمت حاصل ہے جو اسلام وحی الٰہی کے لئے قائل ہے؟ اور اگر مقدس ومعصوم وحی الٰہی اس کا انکار کر دے یا اس کی تردید کر دے تو فکر بشری کی ان اصول وضوابط اور مفاہیم کے سلسلہ میں کیا منزلت رہ جائے گی؟

ان سوالوں کا جواب دینے کے لئے یا اس سلسلہ میں اسلام کا نظریہ معلوم کرنے کے لئے پہلے ہمیں وحی

الٰہی کا مفہوم ،فکر بشری کی حقیقت اور ہرایک کی دلیلوں اور دونوں کی طرف سے اسلامی قانون سازی کے باب میں فراہم کی گئی زمینوں کو مشخص و معین کرنا ہوگا۔

وحی کا تعارف

وحی یعنی خدا اپنے بندوں میں سے کسی ایک کو بعنوان پیامبر انتخاب کرتا ہے اور اسے اپنی جانب سے دنیا کے سارے علوم و معارف کو جو کہ خدا، کائنات اور انسانوں سے متعلق ہیں بڑے مرموز اور محرمانہ طریقہ سے عطا کرتا ہے جو عام انسانوں کی حد و امکان سے خارج ہوتے ہیں۔

لیکن وحی کا مقام و مرتبہ اسلامی قانون سازی میں یہ ہے کہ وحی پر ایمان دین کی ضروریات میں شامل ہے اس کا انکار یا رد کرنا جائز نہیں ہے اور وحی کے ذریعہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حاصل کردہ علوم و معارف اور ہدایتوں میں شک و تردید جائز نہیں ہے کیونکہ یہ مسئلہ خداوند متعال کے اپنے بندوں پر لازم و واجب الایمان مسائل میں سے ایک ہے۔

بنابریں یہ قانون سازی ایک مقدس و معزز قانون سازی ہے جو غلطی و خطا سے محفوظ ہے جس کو نظرانداز کرنا یا اس کا انکار کرنا جائز نہیں ہے اور اس میں انسانی فکر و خیال کی کوئی گنجائش نہیں ہے اسی لئے اس سلسلہ میں ایک فقہی قائدہ موجود ہے کہ:'' **لا مساغ للاجتهاد فی مورد النص** ''نص کے مقام پر اجتہاد کا کوئی جواز نہیں ہے (المجد دی، ۱۴۰۷: ۱۰۸، قاعدة ۲۶۰) اس معنی میں کہ نص کے مقابل میں اور قطعی و یقینی مسائل میں اجتہاد پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے (شوکانی، ۱۴۲۲: ۴۱۸) اور مسلمانوں پر واجب ہے کہ جو کچھ پیغمبر خداؐ کی جانب سے بصورت وحی انھیں ملا ہے کسی قسم کا اظہار خیال، شک و تردید، یا اجتہاد کئے بغیر یقینی طور سے اس پر ایمان لائیں قرآن مجید نے کئی جگہوں پر اس مطلب کی جانب اشارہ کیا ہے: (**وکذالک اوحینا الیک قرآنا عربیا لتنذر ام القریٰ ومن حولها و تنذر یوم الجمع لاریب فیه فریق فی الجنة و فریق فی السعیر**) اور اسی طرح ہم نے

آپ کے اوپر عربی (زبان میں) قرآن کی وحی فرمائی ہے تا کہ آپ ام القریٰ (مکہ) اور اس کے اطراف (ساری دنیا) کے لوگوں کو روز جمع (قیامت) کے دن سے ڈرائیں کہ جس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے جس میں ایک گروہ جنت میں تو دوسرا جہنم میں ہوگا۔

نیز اللہ کا یہ ارشاد:

﴿وکذالک اوحینا الیک روحا من امرنا ما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان و لکن جعلناہ نورا نھدی بہ من نشاء من عبادنا وانک لتھدی الیٰ صراط مستقیم﴾ (سورہ شوریٰ:۵۲)

''اور اسی طرح ہم نے اپنے امر سے ایک روح آپ کی طرف وحی کی ہے آپ اس سے پہلے نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان لیکن ہم نے اسے ایسا نور قرار دیا ہے کہ جس کے ذریعہ ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیدیتے ہیں اور آپ (بھی) یقیناً صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرتے ہیں''۔

یا خدا کا یہ قول:

﴿ وما کان لمومن ولا مومنة اذا قضیٰ اللہ و رسولہ امراً ان یکون لھم الخیرة من امرھم ﴾ (الاحزاب:۳۶)

''اور کسی مومن مرد یا عورت کو جب کہ خدا اور اس کا رسول کوئی فیصلہ سنا دے تو انھیں اپنے مسئلہ میں کوئی اختیار نہیں رہ جاتا''

بنابریں کتاب خدا وسنت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہی اسلامی قانون سازی کا مدرک ومنبع محدود ہے۔

لیکن فکر بشری جو تشریحات اور توضیحات، اجتہادی اصول وضوابط کی بنیاد پر وحی الٰہی سے متعلق مسائل میں ہمارے لئے بیان کرسکتی ہے اور بہت سے مکاتب فقہی ہمارے لئے بطور ہدیہ لاتی ہے وہ سب کے سب خدا و کائنات اور انسان سے متعلق معارف کے سلسلہ میں زمانۂ پیغمبرؐ کے مسلمانوں سے لے کر آج تک کے مسلمانوں کے تفکرات وتدبرات کا نتیجہ ہے اور عقل بشری کے جملہ اجتہادات، ان ہی عام معارف کی تشریح وتفسیر ہیں جو وہ عقائد وشریعت کے اصول وضوابط کے حدود میں رہ کر ہمارے لئے بیان کرتی ہے بغیر اس کے کہ کوئی تفاوت اور حد فاصل، اسلام کے ثابت اصول وضوابط میں، جن کا سرچشمہ کتاب وسنت ہے اور بشری تفسیروں اور اجتہادات میں واقع ہو سکے، کیونکہ وہ اجتہادات بھی اسی کتاب وسنت سے متعلق ہیں۔

ا۔فکر کا حجت ہونا:

انسانی فکر کی حجیت اور وہ دلائل اس پر استوار ہیں حسب ذیل ہیں:

۱/۱۔قرآن کریم میں غور وفکر کرنا

اس اعتبار سے کہ غور وفکر انسان کے وجود کا اہم ترین مظہر ہے اور اسی وجہ سے خداوند عالم نے اسے حیوانوں پر امتیاز بخشا ہے۔ اسے زمین میں اپنا نمائندہ منتخب کیا ہے اور بڑی امانت کو اس کے سپرد کیا ہے تاکہ اپنی مسئولیت کو تفکر وتدبر کے ذریعہ انجام کو پہنچائے۔ خداوند عالم اس سلسلے میں فرماتا ہے:

﴿انا عرضنا الامانة علی السموات و الارض و الجبال فابین ان یحملنها و اشفقن منها و حملها الانسان انه کان ظلوما جهولا﴾

(احزاب/۷۲)

”بے شک ہم نے امانت کو آسمان، زمین اور پہاڑ سب کے سامنے پیش کیا اور سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور خوف ظاہر کیا اور انسان نے اس بوجھ کو اٹھالیا کہ

انسان اپنے حق میں ظالم اور نادان ہے''۔

اس بنا پر غور وفکر کرنا اس کی خلقت میں الٰہی فطرت ہے اور اسلام جو کہ دین فطرت ہے غور وفکر کو رد نہیں کرتا ہے بلکہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اور اس کی طاقت کو معطل نہ کرنے نیز اس کے لئے ایک وسیع زمینہ فراہم کرتا ہے۔ وہ چیز جو کہ اس مسئلہ کی تائید کرتی ہے یہ ہے کہ کوئی بھی آسمانی کتاب یا غیر آسمانی کتابیں قرآن کے مانند نہیں ہے جو انسان کو غور وفکر کی طرف دعوت دے اور اس سے چاہے کہ اپنی عقل کو استعمال کرے اور فکر وتدبر سے کام لے اور اسے اس کے عمل پر رغبت دلائے۔ قرآن مجید کی بہت سی آیتیں اس بات کی خواہاں ہیں کہ انسان دنیا اور زندگی کے مراحل میں غور وفکر کرے۔ (عبدالحمید، بی تا:۱) جیسا کہ خداوند اس سلسلہ میں فرماتا ہے: ﴿ **ان فی ذالک لایات لقوم یتفکرون** ﴾ (رعد/۴) ''وراس میں بھی صاحبان عقل کے لئے بڑی نشانیاں پائی جاتی ہیں''

یا خدا کا یہ قول: ﴿ **و یتفکرون فی خلق السموات و الارض ربنا ما خلقت هذا باطلا سبحانک فقنا عذاب النار** ﴾ (آل عمران/۱۹۱)
''اور آسمان وزمین کی تخلیق میں غور وفکر کرتے ہیں کہ خدایا تو نے یہ سب بیکار نہیں پیدا کیا ہے تو پاک وبے نیاز ہے ہمیں عذاب جہنم سے محفوظ فرما''

یا خدا کا یہ قول:

﴿ **افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت ۞ والی السماء کیف رفعت ۞ و الی الجبال کیف نصبت ۞ و الی الارض کیف سطحت ۞ فذکر انما انت مذکر** ﴾ (غاشیہ/۱۷،۲۱)
''کیا یہ لوگ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے ہیں کہ اسے کس طرح پیدا کیا گیا ہے۔ اور

آسمان کو کس طرح بلند کیا گیا ہے۔اور پہاڑ کو کس طرح نصب کیا گیا ہے۔اور زمین کو کس طرح بچھایا گیا ہے۔لہٰذا تم نصیحت کرتے رہو کہ تم نصیحت ہی کرنے والے ہو‘‘

یا خدا کا یہ قول: ﴿افلا یتدبرون القرآن ام علیٰ قلوب اقفالھا﴾ (محمد/۲۴)

’’ تو کیا یہ لوگ قرآن میں ذرا بھی غور نہیں کرتے ہیں یا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں‘‘

یہ سب قرآن کی آیتیں اور اس کے علاوہ دوسری آیتیں اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ قرآن کریم صریحی طور پر انسان کو غور وفکر اور دنیا کے بارے میں چھان بین اور دین کے سلسلے میں تفکر کی دعوت دیتا ہے تاکہ انسان اس کے وسیلے سے اس مقصد تک پہنچے جسے خداوند عالم نے پیغمبروںؑ اور شریعت کے ذریعہ اس کے لئے منظور کیا ہے۔اور فکر بشر کی تائید و تاکید کر رہا ہے کہ انسان اپنی فکر کو بروی کار لائے جب تک وحی کے قانون اور ہدایت کے دائرہ سے خارج نہ ہو۔

۲/۱۔پیغمبرؐ کی سنت میں غور وفکر

سنت کے آئینہ میں جو کچھ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہم تک پہنچا ہے اس سے ہم پاتے ہیں کہ قرآن کریم کا غور وفکر کی طرف دعوت دینا عملی زندگی ہے آپؐ نے اپنے اصحاب اور مسلمانوں کو زندگی کے امور میں عقل کو بروئے کار لانے اور تفکر و تدبر کی طرف رغبت دلائی ہے۔بغیر اس کے کہ قانون آزاری کے زمینے جو وحی میں محدود ہیں اور انسانی فکر جو اس میں تصرف اور حرکت کا حق رکھتی ہے، میں کوئی آمیختگی پیدا ہوا۔

سب سے اہم چیز جو اس ضمن میں بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ صحابہ کرام نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا کہ کیا آپ کا حکم لوگوں کے لئے وحی کا ایک حصہ ہے یا آپ کی ذاتی فکر ہے؟ پیغمبرؐ نے انھیں جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ سب ان کا ذاتی اجتہاد اور فکر و نظر و تلاش ہے اس کے نتیجہ میں اصحاب نے بھی اپنی فکروں اور نظریے کو آپ کے سامنے بیان کیا اور آپ کے ساتھ غور وفکر کرنے لگے۔

منجملہ اس ضمن میں جو مسئلہ سامنے آیا وہ حضرت کا اپنے اصحاب سے مشورہ کرنا جنگ بدر کے شروع ہونے سے تھوڑی دیر پہلے اور حباب ابن منذر کی رائے کو قبول کرنا ہے حباب نے کہا: (**یا رسول اللّٰہ ارأیت ھذا المنزل اھو منزل انزلک اللہ ، لیس لنا ان نتقدم ولا نتاخر عنہ ام ھو الرای و الحرب و المکیدۃ ؟ قال بل ھو الرای و الحرب و المکیدۃ ؟ قال یا رسول اللہ فان ھذا لیس بمنزل فانھض بالناس حتی ناتی ادنی ماء من القوم فننزلہ ثم نغور ما وراء ہ**) اے خدا کے رسولؐ اس جگہ کو جو آپ نے منتخب کیا ہے خدا نے اس کا حکم دیا ہے اور ہم لوگ اس کے حکم کے آگے یا پیچھے رہنے کا حق نہیں رکھتے ہیں یا یہ کہ اس میں ہمیں راء دینے کی اجازت ہے اور جنگ مکر وحیلہ ہے؟ پیغمبرؐ نے جواب دیا اس میں رائے دینے کی اجازت ہے یہ جنگ وحیلہ ہے پھر حباب نے پیغمبرؐ سے کہا یہاں پر ٹھہرنے کی مناسب جگہ نہیں ہے لوگوں کو یہاں سے کوچ کرنے کا حکم دیں تا کہ اس مکان پر ٹھہریں جہاں سے پانی نزدیک ہو اور پھر وہاں سے آگے بڑھیں گے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بات سے خوش ہوئے اور حباب سے فرمایا: تم نے رائے اور مشورہ کو انجام دیا ہے (البوطی، بی تا:۱۶۹)۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمنے غور وفکر اور اجتہاد اور اپنے نظریہ کو ظاہر کرنا صرف جنگ کے موقع پر اور دوسری مادی چیزوں کے لئے محدود نہیں کیا بلکہ اپنے اصحاب کو اس کے علاوہ عبادت کے مسئلہ میں بھی غور وفکر کی طرف تشویق دلائی ہے اس شرط کے ساتھ کہ دائرہ وحی کے خلاف نہ ہو منجملہ ان میں سے صحابہ کرام کو نماز عصر کے بجالانے میں یا سرزمین قریظہ تک پہنچ کر نماز ادا کرنے میں اجتہاد کی دعوت دی ہے۔ جس وقت پیغمبر نے اصحاب سے فرمایا: (**من کان سامعا مطیعا فلا یصلین العصر الی فی بنی قریضہ**) (السجستانی، بی تا:۳/۳۰۳، الشیبانی ، بی تا : ۴/۶۶) ۔ (جو شخص میری آواز کو سنتا ہے اور اطاعت کرتا ہے وہ نماز عصر کو فقط محلّہ بنی قریظہ میں پڑھے)۔

معاذ بن جبل بھی کہتے ہیں کہ جس وقت پیغمبر اکرمؐ نے مجھے یمن کا قاضی منتخب کر کے روانہ کیا تو مجھ سے فرمایا: اگر تمھارے سامنے کوئی مسئلہ پیش آئے تو تم کس طرح قضاوت (فیصلہ) کرو گے؟ عرض کیا: میری قضاوت خدا کی کتاب قرآن کے مطابق ہوگی۔ پیغمبر نے پوچھا اگر اس کا حکم قرآن میں نہ ملے عرض کیا رسول خداؐ کی سنت کے ذریعہ۔ پیغمبرؐ نے فرمایا اگر اس مسئلہ کو کتاب اور سنت نبوی سے نہ حاصل کر سکے تو؟ عرض کیا اپنے علم و اجتہاد کی بنیاد پر فیصلہ کروں گا۔ اور اس میں ذرا سی بھی کوتاہی نہیں کروں گا اس وقت پیغمبر اکرمؐ نے اپنے ہاتھ کو اس کے سینے پر مارا اور فرمایا: **الحمد لله الذی وفق رسول رسول الله لما یرضی رسول الله.**

یہ عبارت اور اس قسم کے مطالب اور پیغمبر اکرمؐ کی سیرت روشن تفکر و تدبر کی طرف دعوت دیتی ہے، اس شرط کے ساتھ کہ وحی الٰہی کے دائرے میں ہو اور اس سے تجاوز نہ کرے اور اس مسئلہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے انسان کی رائے اور فکر حجت ہے۔

۳۔۱۔ فقہا اور انسانی فکر

علماء اور فقہا نے صحابہ کرام اور ان کے تابعین و تبع تابعین سے انسانی فکر کی حقیقت اور اس کی منزلت کو حاصل کیا ہے، اس لحاظ سے کہ اجتہاد و تفکر اور اپنی رائے کو بروئے کار لانے کے لئے شریعت کو مد نظر رکھتے ہوئے شریعت کے اصول و بنیاد قرار دیا ہے اور اس کے لئے مختلف طور طریقے جیسے قیاس اور استحسان، مصلحت کا وجود، ذرائع و مسائل کا نہ ہونا، اپنے سے ضرر و نقصان کو رد کرنا اور دیگر اجتہادی صورتیں وحی خدا کے وصول و ضوابط سے ٹکراؤ نہیں رکھتے ہیں علماء اسلام اجتہاد اور تفکر کے بارے میں تقریباً اتفاق کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں۔ امام شافعی کہتے ہیں: (خداوند عالم نے اپنے بندوں کو عقل کی دولت سے مالا مال کیا ہے تا کہ اس کے ذریعہ فرق اور تمیز پیدا کر سکیں اور ان لوگوں کو حق کی جانب دلیل و برہان کے ذریعہ ہدایت کریں) (شافعی، بی تا: ۵۰۱)۔ ابن حزم نے عقل کی حجت کے بارے میں اور ان لوگوں کے جواب میں جنھوں نے عقل کے حکم کو باطل قرار دیا ہے کہتے ہیں: (ہم یہ نہیں کہتے ہیں

ہر مذہب کا پیرو اپنے اعتقاد کے اعتبار سے حق پر ہے یا ہر استدلال اور دلیل ہر مذہب کے لئے قابل قبول ہے لیکن یقین رکھتے ہیں کہ کچھ دلائل اس قدر واضح اور درست ہے کہ صحیح مذہب کی سمت ہدایت کرتے ہیں جس طرح ہم نے اسے بیان کیا ہے اور اس کے حکم کو ذکر کیا ہے... استدلال اگر صحیح روش اور استدلال کے برخلاف ہوں تو غلط اور فاسد مذہب کی طرف رہنمائی کر سکتے ہیں) (اندلسی، ۱۴۰۴: ۱/۱۷) لیکن ابن تیمیہ ان لوگوں کی بات کو رد کرتے ہیں جو لوگ مطلق طور سے عقلی دلیلوں پر اعتراض کرتے ہیں کیونکہ وہ لوگ خیال وگمان کرتے ہیں کہ عقلی دلیلیں وہی سخن وروں اور فلسفیوں کے نئے خیالات ہیں (عبدالحمید، بی تا: ۱۳)۔

اس اعتبار سے، فقہاء کی راہنمائیاں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ کتاب خدا وسنت نبوی کے مطابق اور ان کی پابند وتابعدار فکر اور قرآن وسنت کی غیر پابند فکر میں فرق ہے جو کچھ کتاب خدا اور سنت نبوی کے مطابق ہو وہی رائے قابل ہے اور اس میں شک وشبہہ کی گنجائش نہیں ہے اور جو کتاب وسنت کے موافق نہ ہو شرعی نقطۂ نظر سے قابل قبول نہیں ہے کہ اس کے مطابق فیصلہ کیا جا سکے۔ ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں اسلامی قانون کے نفاذ میں کچھ تحقیق کی جائے تا کہ اسلامی فکر کے نتائج سے آگاہ ہوسکیں۔

۲۔ پیغمبر اکرمؐ کی زندگی میں اجتہادی فکر ونظر

قانون اور احکام کا نفاذ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں وحی الٰہی یعنی کتاب خدا اور سنت پر موقوف تھا لیکن پیغمبر نے کچھ مسائل میں قانون کو نافذ کرنے کے لئے ذاتی اجتہاد اور رای کو مد نظر رکھا اور اسی طور طریقے کو مسلمانوں کے لئے فکری کاموں میں تعلیم دیا پیغمبر اکرمؐ کے اجتہاد میں سے ایک اجتہاد یہ تھا کہ بدر کے اسیروں اور قیدیوں سے فدیہ حاصل کیا جائے۔ (الصنعانی، ۱۴۰۳: ۵/۲۱۱)

اور پیغمبر اکرمؐ نے ان لوگوں کو مدینہ میں رہنے کی اجازت دی جن لوگوں نے جنگ تبوک میں حاضر ہونے سے عذر تراشی کی تھی۔ (الشوکانی، بی تا: ۲/۴۱۳)

اس کے علاوہ پیغمبروں نے کچھ صحابہ کو اجازت دی کہ اپنی فکر و عقل سے استفادہ کریں جس طرح اس سلسلے میں پیغمبر اکرمؐ نے معاذ بن حنبل کو یمن کا قاضی معین کرتے وقت بیان فرمایا ہے۔(البیہقی، ۱۴۱۴)۔

اس کے علاوہ پیغمبر اکرمؐ نے کہ صحابہ کو فکر و نظر و رائے اور اپنی عقل کے مطابق عمل کرنے کا شوق دلایا۔ جس طرح کہ نماز پڑھنے کی داستان بنی قریضہ میں پیش آئی اور انھیں نماز عصر کے پڑھنے کے وقت کو منتخب کرنے کا اختیار دیا اور نتیجے کے طور پر دونوں گروہ کے کاموں کو صحیح سمجھا کیونکہ ان میں سے ہر ایک گروہ نے اپنے درک وفہم کے اعتبار سے انجام دیا تھا۔

۳۔عصرِ پیغمبر کے بعد اجتہادی فکر

رسول خداؐ کی رحلت اور سلسلہ وحی کے منقطع ہونے کے بعد گزشتہ زمانہ سے زیادہ رائے و اجتہاد سے استفادہ کرنا نمایاں ہوگیا۔ اور یہ موضوع امت اسلام کی سرزمین میں پیش آنے والے جدید مسائل اور بدلتے ہوئے تمدن سے بہت ہم آہنگ تھا۔

خلفاء راشدین کتاب وسنت میں فقدان نص کی صورت میں جدید مسائل میں اجتہاد کرتے تھے۔ اور اپنے نظریات کو بحث و مناقشہ کے لئے پیش کرتے تھے۔لیکن انھوں نے جس اجتہاد کی مذمت کی ہے اس کا تعلق ان فاسد نظریات و اجتہادات سے ہے جو ان مسائل میں کئے جاتے تھے جن کے بارے میں نص یا دوسرا صحیح نظریہ پایا جاتا تھا اور جن کو علماء نے عمومی مقاصد اور شریعت کے اصول سے لاعلمی کی وجہ سے بیان کر دیا تھا۔

لیکن وہ نظریہ اور رائے جو کتاب وسنت سے استنباط شدہ ہوتا تھا انھیں تسلیم کرتے تھے، اور وہ جانتے تھے کہ شریعت بندگان خدا کے منافع کو محقق کرنے اور ان سے مفاسد کو دور کرنے کے لئے آئی ہے۔ اس دور میں اسلامی فکر کی تحریک دو عمدہ سمت کی طرف حرکت کر رہی تھی۔

پہلے: شرعی متون کی فہم کی کیفیت میں اجتہاد: مثال کے طور پر، قرآن مجید نے مولفۃ قلوبہم یعنی مستضعفین

، دبے کچلے افراد کے لئے آیہ کے مطابق زکات سے ایک سہم اس زمانے میں جب مسلمان نہایت ضعیف اور کمزور تھے، ان کے دلوں کو نزدیک کرنے اور ان کے شر سے محفوظ رہنے کی ضرورت تھی، کے قائل تھے، لیکن جب مسلمان قوی ہوگئے، اور عمر بن خطاب کے زمانہ میں ان کی حکومت کو عظمت حاصل ہوئی پھر اس حکم کے اجراء کرنے کی ضرورت نہیں رہی اس وجہ سے عمر نے **مولفة قلوبهم** کے سہم کو زکات ختم کر دیا۔ انھوں نے اس حکم کو وحی کی وجہ سے ختم نہیں کیا لیکن وہ خود غور وفکر سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس حکم کے اجراء کرنے کے شرائط فراہم نہیں ہیں بلکہ مستضعفین کے بارے میں نئے شرائط پیدا ہوگیے ہیں اس وجہ سے اسلامی سماج سے اس حکم کو منسوخ کر دیا۔

دوسرے: جدید مسائل میں اجتہاد جو مورد نیاز مصلحت کو جلب کرے یا واضح فساد کو دفع کرے۔ جیسے عمر بن الخطاب اور چند اصحاب کا اجتہاد جو انھوں نے عراق کو فتح کرنے کے وقت کیا تھا اور وہ یہ تھا کہ انھوں نے سر زمین عراق کو فاتحین کے درمیان تقسیم کرنے سے روک دیا تھا۔ انھوں نے اپنے دل میں سوچا کہ اس سرزمین کی تقسیم سبب بنے گی کہ کچھ قلیل افراد کے پاس کثرت سے دولت جمع ہو جائے اور حکومت نیز کثیر تعداد میں افراد اس دولت سے محروم ہو جائیں۔ خداوند کریم کے اس قول کے مطابق "**کی لا یکون دول بین الاغنِیا مِنکم** "مال و دولت صرف دولت مندوں کے ہاتھوں سے گردش نہ کرے، تابعین اور تبع تابعین نے بھی ان کے بعد یہی روش اختیار کی، اور جدید مسائل میں جو زمانہ کی ترقی کیوجہ سے پیش آتے تھے۔ اپنے اجتہاد اور نظریہ سے استفادہ کیا۔ یہاں تک کہ فقہی مکاتب کا ظہور ہوا وہ مذاہب بھی جو اسلام کے شرعی احکام کی نرمی اور لوچ کی ماہیت کی نشاندہی کر رہے تھے، ظاہر ہوئے، یہ اس طریقے سے انھوں نے قانون گزاری کہ عظیم دولت کو یادگار چھوڑا اس طرح کہ مختلف زمان و مکان میں بہت سے اقوام کی زندگی پر اثر انداز ہوئے۔

یہ مسئلہ نئی اسلامی فکر کی تحریک کے استمرار اور اس کی نرمی پر محکم دلیل ہونے کی نشاندہی کر رہا تھا جو وقایع جدید سے اور کتاب وسنت کے دقیق درک کی مدد سے اس سے ہماہنگی کر سکے، بغیر اس کے کہ اس کام میں پیچیدگی،

جمود اور تنگ نظری کا شکار ہو، اور یہ چیز منظّم و با اصول اسلامی فہم کے ساتھ ساتھ افراط و تفریط کے بغیر رہی ہے۔

مذکورہ بالا باتوں کی روشنی میں ہم حسب ذیل حقائق کو ثابت کر سکتے ہیں:

۱۔ قرآن مجید کے متون عقیدہ اسلامی کے اصول کے محکم ہونے کا سبب ہیں جو خداوند متعال، فرشتے، آسمانی کتابوں، خدا کے پیغمبروں، قیامت، قضاو قدر اور اعمال کے خوب و بد سے مرتبط ہے اور انسانی عقل اس کی ماھیت میں دخالت کا حق نہیں رکھتی، مگر اتنی مقدار میں کہ انسان اس کے عناصر کو علمی اور منطقی دلیل و برہان سے اس طرح ثابت کرے جس کے ذریعہ عقائدی ارکان پر ایمان لانا ممکن ہو۔

۲۔ ہر انسانی فکر جو قرآن و سنت سے ہماہنگ نہ ہو، اس کو اسلامی فکر نہیں کہیں گے چاہے وہ فکر تصوف ہو، یا عملی قانون گزاری جس کو ہم اسلامی تفکر کہتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ فکر اسلام سے ہماہنگ ہو، اور اگر فکر بشر جو عقل مستقل سے پیدا ہوئی ہو، اور ان مفاہیم کا اسلامی ہونا ثابت نہ ہو تو اس کو اسلامی فکر نہیں کہہ سکتے، اسی وجہ سے وہ فکر جس کا مبدا اسلام نہیں ہے۔ عقل و منطق کی رو سے ان کو اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔

۳۔ ہم انسانی اسلامی نظریہ کو خود اسلامی فکر نہیں کہہ سکتے ہم اس کو اسلام، عقیدہ اور شریعت اسلام کا نمایندہ نہیں مان سکتے بلکہ ایسا عقیدہ قرآن کے فہم کی صورتوں میں ایک صورت ہوگا۔ اس بنیاد پر اسلامی فکر کے مذاہب، اجتہادات اور نظریات فقہ و شریعت میں نوع در نوع ہو گئے یہاں تک کہ اس بارے میں امام شافعی فرماتے ہیں کہ ہمارا نظریہ رجحان رکھتا لیکن اس میں خطا کا احتمال پایا جاتا ہے اور دوسروں کا نظریہ رجحان نہیں رکھتا کیوں کہ اس میں صحیح ہونے کا احتمال پایا جاتا ہے۔

۴۔ جائز نہیں ہے کہ اسلام کو ایک اندیشہ یا نظریہ سمجھیں، کیوں کہ اندیشہ اور نظریہ انسانی عقل کی پیداوار ہے، درحالیکہ اسلام ایسا نہیں ہے بلکہ اسلام وہ مقدس وحی ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور انسانی نظریہ اور وحی کے درمیان بڑا فرق ہے۔

اس اصل کی بنا پر ہم یہ کہیں گے:

خدائی وحی ایک ایسا مقدس اور پاک و پاکیزہ دین ہے کہ ہم اس کے نصوص اور متون میں کسی قسم کی دستکاری وتصرف نہیں کر سکتے، اور نہ اس پر کسی قسم کا اعتراض کر سکتے ہیں۔ درحالیکہ انسانی نظریہ انسان کے ذریعہ اس وحی کے سمجھنے کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ اسی بنا پر وہ چیزیں جو کتاب وسنت کے موافق ہوں شرع مقدس اس کو تسلیم کرتی ہے، اور وہ مسائل جو کتاب وسنت کے برخلاف ہوں شرع اس کو ٹھکرا دیتی ہے۔ اس لحاظ سے کہ اجتہاد بھی نظریہ بشری کے اقسام میں سے ایک قسم ہے جو شریعت کے اصول اور اس کے دستور سے مرتب ومنظّم ہے اور کلام خدا سمجھنے کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ وہ علماء اور فقہاء اور دانشور جو سماج میں مقام ومنزلت رکھتے ہیں۔ ان کو چاہئے کہ اپنے نظریہ کو تعاون اور قربت کا وسیلہ قرار دیں، ان کو دوری اور اختلاف کا وسیلہ اور ذریعہ نہیں بنانا چاہئے۔ ان کو اپنے اسلامی نظریہ پر جو دوسرے اسلامی فرقوں کے نظریہ واجتہاد کے حق میں ضرر ونقصان کا سبب ہو تعصب سے کام نہ لینا چاہئے اگر اسلام اور وحی کے سمجھنے میں دو اجتہادی نظریہ پایا جائے۔ اور دونوں طرف نے ادلہ شرعی سے اس کو اخذ کیا ہو، جیسا کہ رسول گرامی اسلامؐ اس بارے میں فرماتے ہیں: اگر مجتہد کسی حکم کا استنباط کرے اور وہ واقعیت کے مطابق ہو تو اس کو دو اجر اور ثواب ملے گا، اگر وہ حکم واقعیت کے مطابق نہ ہو تو اس کو ایک اجر اور ثواب ملے گا۔ (بخاری، ۲۶۷۶/۶:۱۴۰۷)۔

ج۔ فقہی مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان موجود رابطہ

جب تک اجتہاد ایک وظیفہ اور ایک فریضہ رہے گا، اور جب تک اس میں تنوع اور نوآوری، صحت اور موضوعیت کی علامت رہے گی، نہ کہ بیماری اور خودخواہی کی علامت، اور جب تک اجتہاد دین اور امت کے درمیان جو ہر زمان ومکان میں قوموں کے تمدن کی ترقی سے ہماھنگی کرنے کی وجہ سے نئے وقائع اور جدید مسائل میں دین اور قوم کے درمیان واقعی تعاون کرنے کی تاکید کرتا رہے گا۔ اسلامی فقہی مذاہب کے پیرووں کے درمیان روابط بھی

ایسے ہی موافق خصوصیت کے حامل ہونے چاہئیں تا کہ مسلمین اوران کے گونا گون مکاتب فکر کے درمیان قانون گزاری اور نظریہ کے درمیان موافقت ہو، مذاہب کے ایسی صورت میں مختلف (مذاہب کے پیرووں کے درمیان ماضی اور حال میں روابط کی کیسے تحقیق کی جا سکتی ہے۔

مسلمانوں نے رسول خداؐ کی جانب سے مدون اور محفوظ قرآن کو دریافت کیا،صحابہ اور تابعین کے ذریعہ تمام ممالک میں روایات کو منتشر کیا گیا۔علماء نے جگہ جگہ جا کر سنت پیغمبرؐ کو تدوین کیا۔آخر کار ان کوششوں نے فقہی مکاتب کی شکل اختیار کرلی ان مذاہب کے پروگرام اور اصول مشخص ہوئے اوران میں سے بعض اصول شرعی کے بارے میں نیز بعض اصول کو بعض دوسرے اصول پر مقدم کرنے کے اعتبار سے علماء نے آپس میں اختلاف نظر پیدا کرلیا۔

ان بعض اصول کا اختلاف فقہی مسائل میں اختلاف کا سبب بن گیا۔اور مذاہب کے علماء کے درمیان کافی بحث ہوئی، اوران کے درمیان مناظرہ اور باہمی گفتگو ہوئی۔ یہ سب مسائل خلفاء کے لئے علوم، خاص طور سے علم فقہ کی طرف توجہ کا سبب بننے اوران علوم میں ان کی شرکت اور بحث ومناظرہ پر نگرانی بھی ہوئی۔

بعض فقہا کی فرضی فقہ میں مشغولیت نے بھی اختلاف کے دائرہ کو کافی وسعت دی لیکن دلیل و برھان سے مخالفت ایک بری چیز سمجھی جاتی تھی۔اس زمانے کے علماء تقلید کے مخالف تھے وہ دلیل کی طرف توجہ رکھتے تھے، تعصب کو بری نگاہ سے دیکھتے تھےاورحق کے طرفدار تھے ولو کسی کی طرف سے پیش کیا گیا ہو۔

صحابہ اور تابعین ان کے بعد فقہاء اور مجتہدین کے درمیان بہت سے مسائل میں اختلاف ایک علمی ضرورت اور ایک طبیعی مسئلہ تھا جس کا ادلہ شرعیہ اوران کے متون کے ادراک وفہم تقاضا کر رہے تھے۔ یہ اختلاف تقلید اور تعصب سے وجود میں نہیں آیا۔مذاہب کے پیرو ہر ایک مسئلہ کے لئے دلیل پیش کرتے تھے۔اور علمی اعتبار سے اس کے صحیح ہونے پر مطمئن تھے اوراس کے بعد اپنے مذہب سے دست بردار نہیں ہوتے تھے۔

صحابہ اور تابعین اور بزرگ مجتہدین کے درمیان اختلاف ان میں جدائی اور دشمنی اور نزاع کا سبب نہیں بنتا تھا، ان میں بعض ایک دوسرے کو دعوت دیتے تھے، اور ایک دوسرے کی اقتدا میں نماز پڑھتے تھے، لیکن ان کے مقلدین ایک دوسرے سے دشمنی کرتے تھے، اور اپنے دل میں ایک دوسرے سے کینہ رکھتے تھے، اپنے مخالف مذہب کی اقتدا میں نماز نہیں پڑھتے تھے اور ایک دوسرے کی سرزنش اور طعن وتشنیع کرتے تھے۔ شیخ محمد رشید رضا اس بارے میں فرماتے ہیں کہ مذہب سے تعصب رکھنے والے نہیں جانتے تھے، کہ ان کے لئے اختلاف مرحمت ہے ان میں ہر ایک اپنے مذہب کی تقلید کو ضروری سمجھتا تھا، اور اپنے پیروں کو دوسروں کی تقلید کرنے سے حتی اپنے شخصی مفاد کے لئے تحریم کرتا تھا۔ کچھ لوگ ایک دوسروں کی طعن وتشنیع کرتے تھے اور بعض تاریخی کتابوں میں مشہور ہے کہ مسلمان اگر کسی ایسے ملک میں جاتے کہ جہاں کے باشندے کسی دوسرے مذہب کی پیروی کرتے تو اس شخص کی طرف اس طرح دیکھتے جیسے کہ بیمار اونٹ ان کے سامنے آ گیا ہو ان سے اس طرح برتاؤ کرتے تھے جیسے شوکانی فرماتے ہیں کہ کچھ زیدیہ علم کے مدعی تھے ایک نیک مرد کی طرف اس وجہ سے کفر کی نسبت دیتے تھے کہ اس شخص نے دعا کے لئے ان کی روش کے برخلاف ہاتھ اٹھالیا تھا اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایک زمانہ میں یمن میں لقب سنی بڑا برا لقب سمجھا جاتا تھا ۔ اس لئے کہ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ سنی ان کو کہا جاتا ہے جو معاویہ کے طرفدار اور علی علیہ السلام کے مخالف ہوں ۔ (الاشقر، ۱۴۱۲، ۵: ۱۷۵۔۱۷۶)۔

مذاہب کے پیروؤں کے مقلدین کے درمیان اختلاف اور کشمکش اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو دشمن سمجھتے تھے ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے تھے ان کو اذیت پہنچانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ اور یہ مسئلہ بہت سے فتنوں کے پیدا ہونے کا سبب بن گیا۔

تاریخ ایسی بہت سی داستانوں کو ہمارے لئے بیان کرتی ہے۔ منجملہ حافظ بن کثیر تحریر فرماتے ہیں کہ ۵۹۵ قمری ہجری میں افضل بن صلاح الدین بادشاہ کا انتقال ہو گیا، عزیز مصر نے یہ ارادہ کرلیا کہ اپنے ملک سے حنبلیوں کو

نکال دے اور اس نے اپنے دوسرے بھائیوں کے پاس خط لکھا کہ وہ بھی ان کو اپنے ممالک سے باہر نکال دیں (ابن کثیر،۱۹۶۶: ۱۸/۱۳)۔

خراسان کے شہروں میں عظیم فتنہ برپا ہوا جس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جب فخر الدین رازی غزنہ کے بادشاہ کے پاس گئے۔ بادشاہ نے ان کا بہت احترام کیا اور ہرات میں ان کے لئے ایک مدرسہ کی تعمیر کی۔ لیکن اس شہر کے باشندے جو ان کے مذہب کے پیروں نہیں تھے ان سے دشمنی کرنے لگے ان سے مناظرہ کرنے لگے ایک مناظرہ میں بڑی مار پیٹ ہوئی لوگوں نے ان کے خلاف قیام کیا آخر کار بادشاہ نے ان کو ملک سے باہر نکل جانے کا حکم دیدیا (ہمان: ۱۹-۲۱)۔

حنفیوں اور شافعیوں کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا تھا کبھی کبھی یہ اختلاف ایک ملک کے برباد ہو جانے کا سبب بنتا تھا۔ یاقوت حموی شہر اصفہان کی گزشتہ دور کی عظمت کے بارے میں لکھتا ہے کہ اس شہر اور اس کے بعض حصوں میں حنبلیوں اور شفعیوں کے درمیان تعصب اور کثیر فتنوں اور ان دو گروہ کے درمیان مار پیٹ سے بڑی خرابی پیدا ہوئی، ایک فرقہ دوسرے فرقے کے محلّہ کو لوٹ لیتا تھا، پھر اس میں آگ لگا دیتا تھا اور خراب کر دیتا تھا۔ پھر بھی ان کا وجدان بیدار نہیں ہوتا تھا۔ یہ واقعہ اس شہر کے قصبوں اور دیہاتوں میں بھی واقع ہوتا تھا (حموی، بی تا: ۲۷۳/۱)۔

شیعہ اور سنی کے درمیان کشمکش بھی مشہور ہے۔ تاریخی کتابیں ایسے واقعات سے مملو ہیں منجملہ ابن اثیر ۴۴۳ ہجری کے واقعات کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس سال دوبارہ شیعہ اور سنی کے درمیان فتنہ کی آگ بھڑک اٹھی جو گزشتہ سے زیادہ سخت تھی پھر وہ اس اختلاف کے ایک اہلسنت کے ہاشمی مرد کے قتل کی وجہ سے جنگ و خونریزی کی صورت میں بدلنے کی کیفیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس شخص کے خاندان کے لوگ اس کے جنازہ کو اٹھا کر لوگوں کو اس کے قتل کا انتقام لینے کے لئے تحریک کر رہے تھے پھر وہ مشہد میں حرم امام علی رضا علیہ

السلام میں داخل ہوئے اور اس کی قیمتی چیزوں کو لوٹ لے گئے اور بہت سے بزرگوں کی قبروں میں آگ لگا دی، اس کے بعد شیعوں نے حنفی فقہاء کے گھروں پر حملہ کر دیا اور ان کو تہس نہس کر دیا۔ اور ابوسعد سرخسی جو حنفی مدرس تھے ان کو قتل کر دیا۔ اور فقہا کے گھروں میں آگ لگا دی۔ (ابی شامہ، بی تا: ۳۲/۳)۔

نفرت انگیز مذہبی تعصب امت اسلامی کے پیرووں کے درمیان اختلاف کے ایجاد اور وحدت کے پاش پاش ہونے اور امت کے درمیان تقسیم بندی ایک دوسرے کو دشمن سمجھنے آپسی جھگڑا لڑائی کا سبب بنا، دشمن جو گھات میں بیٹھا ہوا تھا، اور ان کے درمیان اختلاف اور ہرج و مرج کا منتظر تھا اس نے اس قوم کو اپنے کنٹرول میں لے لیا، اور ان کو ذلیل و رسوا کرنے میں مشغول ہو گیا، ان تمام مسائل کی اصل علت یہ تھی کہ امت واحدہ کے فرزندوں کے درمیان گفتگو کا کوئی صحیح پروگرام نہیں تھا۔ مذاہب اسلامی اور فرق اسلامی کے درمیان شایستہ طور پر بحث و مباحثہ، تفہیم و تفاہم ہوتا تھا، لیکن آخرکار، سخت اور تندروستیوں کا شکار ہو جاتا تھا، اور مخالفین سے بڑی سختی سے پیش آتے اور ایک دوسرے کی طرف بدنیتی کی نسبت دیکر تہمت لگاتے، بہت جلد بازی سے کام لیتے تھے، اور ایک دوسرے کی طرف سوئے ظن اور شبہہ کا الزام لگاتے تھے۔ اسی وجہ سے بہت سے لوگوں نے مسلمانوں کی فقہی بحثوں کے بارے میں تصور کر لیا کہ حقیقت متون کی حرفی تفسیر کے سہارے چند احتمال نہیں رکھ سکتی، حقیقت کو اس کے سیاق سے جدا نہیں کیا جا سکتا یا احکام کو اس کے فلسفہ اور اس کے حکم سے ربط نہیں دیا جا سکتا۔

بیشک متون شرعی میں غور و فکر، دقت و تامل کرنے نیز ان متون اور دوسرے متون کو جمع کرنے کے لئے بلا شبہ عقلی اور اجتہاد کی رسیدگی کی ضرورت ہے جو حق و حقیقت تک پہنچائے۔ اور یہ اس وقت ممکن ہے جب مکمل طور پر کشمکش اور جدائی سے متفاوت رہے، اور اسلامی وسعت قلبی، آرا اور نظریات کے اختلاف کے تحمل کرنے کی تاب پیدا کرے گی۔ اور یہ سینہ ایسے اجتہاد کے ساتھ یہاں تک کہ اگر اس اجتہاد کا مالک خطا اور اشتباہ میں دوچار ہو جائے اور حقیقت سے دور ہو جائے جب بھی تنگ نہیں ہوگا۔

اسی وجہ سے مذاہب اسلامی کے پیرووں سے اسلامی مسائل اوراحکام کے بارے میں گفتگوکرنے والوں کو چاہیئے کہ وہ درک کریں کہ اتحاد، ''حقیقت'' نظریاتی اختلاف اس کے متعلق متعدد آراء کولغونہیں کرتا ہے اسی وجہ سے تاریخ نے صحابہ کے درمیان اختلاف کو جو بہت سے قرآنی اوراحدیث نبوی کے متون کے بارے میں پائے گئے ہیں بیان کیا ہے۔ اوراسی طرح تاریخ نے تابعین اوران کے پیرووں کے درمیان نیز ان کے بعد مجتہدین کے درمیان اختلافات کو جو بہت سے فقہی مسائل میں پائے گئے ہیں، بیان کیا ہے، درحالیکہ اس اختلاف نظر کے باوجود خودان میں کسی قسم کا کوئی جھگڑا نہیں تھا، اور نہ ان میں کوئی دوسرے کی توہین کرتا تھا۔ان کے درمیان یہ قاعدہ مشہور تھا کہ نظریہ کا اختلاف اصل مسئلہ کوملغی نہیں کرسکتا۔اوروہ جس اصل مرکز کے اردگرد چکرلگاتے تھے وہ اصل بتاتی تھی کہ ہمارانظریہ اس وجہ سے رجحان رکھتا ہے۔کیوں کہ اس میں خطا کا احتمال پایا جاتا ہے، اور ہمارے نظریہ کے علاوہ نظریہ رجحان نہیں رکھتا، کیوں کہ اس میں صحیح ہونے کا احتمال پایا جاتا ہے۔

فرق اور مذاہب اسلامی کے درمیان گفتگوکرتے وقت ضروری ہے کہ وہ مسائل جن کا وحی سے تعلق ہے(جن کونظرانداز نہیں کیا جاسکتا اورکوئی بھی مسلمان اس کے علاوہ کسی اور چیز کونہیں انتخاب کرسکتا)۔نیز وہ اجتہادی نظریاتی مسائل اورمتون کی تفسیر، اوراس کے معنی اورمقصود کی وضاحت اوروہ مسائل جن کاتعلق دینوی امور سے ہے یاوہ امور جن کاتعلق عادات واطوار سے ہے ان کے درمیان فرق ڈالیں، تاکہ گفتگوکرنے والے افراد ان مسائل کے بارے میں جولوگوں کی ضروریات اورمفادکوتامین کرتے ہیں تبادلۂ خیال کریں، بغیراس کے کہ وہ کسی مشکل میں پھنس جائیں جیسے اسلام سے خارج ہوجانا، یاکسی اسلامی حکم کوسبک سمجھیں یااسلام کے ارکان کوویران کریں۔

منظّم دینی گفتگو

اگرآج چاہیں کہ اسلامی فرق ومذاہب کے درمیان گفتگواپنے مقاصدتک پہنچنے میں موفق رہے توچاہیئے کہ چند باتوں کومدنظررکھیں۔

ہمارے زمانے میں اسلامی احکام کے اجرا کرنے کے لئے ایک وسیع پیمانہ پر عقلی اجتہاد کی ضرورت ہے چونکہ شرعی متون آیات قرآن اور سنت پیغمبرؐ میں محدود اور جدید مسائل انقلاب زمانہ کی وجہ سے غیر محدود ہیں، قانون گزار کو بھی چاہئے کہ وہ زمان و مکان کے اعتبار سے آگے بڑھے، تا کہ اس اعتبار سے اسلام کی جاویدانی اور اس کا قانون ہر زمان اور مکان کے لئے ساز گار رہے۔ فقدانِ نص کی صورت میں احکام شرعی کے حاصل کرنے کے لئے اجتہاد بڑی ضروری چیز ہے اور یہ بات نص سے ثابت ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے معاذ بن جبل کو یمن کی قضاوت کا عہدہ دیتے وقت اس موضوع پر گفتگو ہوئی ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ پیغمبرؐ نے ان سے دریافت کیا کہ اگر ان کے پاس قضاوت کے لئے کوئی ایسا مسئلہ پیش آجائے جس کے حل کے لئے کتاب و سنت میں کچھ نہ مل رہا ہو تو کیسے اس مسئلہ کو حل کریں گے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں اجتہاد کروں گا۔ پیغمبرؐ نے ان کے اجتہاد کی تحسین و تعریف کی، اور ارشاد فرمایا کہ یہ راستہ، یعنی احکام میں اجتہاد، خدا اور رسولؐ کو راضی کر دیگا۔ نیز یہ بھی اظہار کر رہے تھے کہ خدا کا شکر گزار ہوں، جس نے پیغمبرؐ کے مبلغ کو کامیابی سے ہمکنار کیا ہے۔ (ترمذی، بی تا: ۶۶/۳ و ابن ابی شیبہ، ۱۴۰۹: ۵۴۳/۴) پیغمبرؐ کی متواتر حدیثیں متون کی تفسیر میں رسول اکرمؐ سے اور فقدان نص کی صورت میں رسول خداؐ اور ان کے صحابہ کا اجتہاد اس بات کی تائید کرتا ہے۔ ابن عمر سے منقول ہے کہ جب رسول خداؐ جنگ احزاب سے واپس ہو رہے تھے مجھ سے فرمایا کہ تم میں سے کوئی بھی نماز عصر نہیں پڑھے مگر بنی قریظہ میں، عصر کے وقت راستے میں تھے کچھ لوگوں نے کہا ہم بنی قریظہ ہی میں جا کر نماز عصر پڑھیں گے، کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم یہیں نماز پڑھیں گے چونکہ ہم سے کوئی ایسا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے۔ جس وقت یہ بات رسول خداؐ کی خدمت میں پیش کی گئی، پیغمبرؐ نے ان میں کسی سے کچھ نہیں کہا (صحیح بخاری، بی تا: ۳۲۱/۱، صحیح مسلم، بی تا: ۱۳۹/۳ و صحیح ابن حبان، بی تا: ۳۲۱/۴)۔

یہ خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ پیغمبر اپنے اصحاب کے اجتہاد کو تسلیم کرتے تھے۔ اور ان میں کسی سے

اس مسئلہ کی نتیجہ گیری اور فہم کی وجہ سے کوئی ردعمل پیش نہیں کیا تا کہ قانون گزاری اور تصمیم میں نامحدود مسائل کے لئے جواب دہ رہے۔

اسلام ایک ایسا نظام حیات ہے جس کے احکام کا کوئی نہ کوئی فلسفہ پایا جاتا ہے۔اس کی قانون گزاری منظّم مقاصد کے ساتھ ہے۔عقول سلیم ان کو درک کرسکتی ہیں وہ عقل سے جدا نہیں ہیں اگر وہ عقل سے جدا ہو جائیں تو رحمت زائل، عدل ساقط اور ناممکن ہو جائے گا۔شریعت کی بنیاد سب کی سب عدل و رحمت اور حکمت ہے۔اس بنا پر عدل کا جو مسئلہ ظلم و ستم کا رحمت سے نقمت کا، مصلحت سے مفسدہ، حکمت سے عبث و بیہودگی کا باعث ہو، اس کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہوگا، چاہے اس کی سیکڑوں تاویل تفسیر سے کی جائے۔شریعت، بندوں کے درمیان خدا کا عدل، مخلوق کے درمیان اس کی رحمت، زمین میں اس کا سایہ، اور اس کے وجود پر اور اس کے رسول کی صداقت پر دلالت کرنے والی حکمت اور کامل ترین اور صادق ترین دلالت ہے (ابن قیم،۱۹۷۳ :۳/۳)۔اس کے برخلاف شریعت کی ہدایت عوام کے منافع سے احکام کے مرتبط ہونے میں، قرآن کے ذکر خدا ہونے اور اس پر عمل کرنے میں ٹکراو ہو جائے گا اسی وجہ سے جو اسلام ہم لوگوں کے سامنے پیش کریں، گہری فکر تاثیر پذیر اجتہاد کے ہمراہ علل و مقاصد کی تلاش کرنے والا ہو جس کو الفاظ کی چہار دیواری میں سمویا نہیں جاسکتا، مگر یہ کہ مسئلہ ان عبادات سے ارتباط رکھتا ہو جن کے علل و اسباب اور احکام کی تہ تک پہنچنے کی عقل انسانی توانائی نہ رکھتی ہو۔(دیکھئے، قرضاوی، ۱۲۱۰: ۱۱۴_۱۷۲)

اس وجہ سے عقل انسانی ان احکام شرعی کے بارے میں تعامل کرسکتی ہے جو علل و اسباب و اہداف سے مربوط ہیں اور ان کو خدا کی مراد اور مقصود حاصل کرنے کے لئے شرعی متون کی تفسیر و تفہیم کا وسیلہ قرار دے سکتی ہے۔ اسلام اپنے پیرووں کو دنیا کی کشمکش میں مبتلا نہیں کرتا چونکہ حقیقی اور پکا مسلمان وہ ہے جو دنیا اور لوگوں کو ناپسند نہ کرتا ہو اور اپنی پیاری عمر کو طبیعت اور ناموس طبیعت کی خیالی جنگ میں تلف نہ کرے اور عقیدہ رکھتا ہو کہ زندگی خداوند عالم کی

دی ہوئی چیز ہے۔''اعطی کل شی خلقه ثم هدی''اس نے ہر شئے کو بڑی خوبی سے خلق کیا پھر اس کو ہدایت کی۔خداوند عالم نے تمام اشیا کو انسان کے لئے خلق کیا ہے پھر اس سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کو آباد کرے'' و اِذ قال ربک لِلملائِکۃِ اِنِی جاعِل فِی الارضِ خلِیفه''(بقرہ:۳۰) خداوند عالم نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔نیز یہ بھی فرمایا:''هو انشاکم مِن الارضِ و استعمر کم فِیها'' (ہود:۱۶) اس نے تم کو زمین، مٹی سے خلق کیا اور تم سے مطالبہ کیا ہے کہ زمین کو آباد کرو، اس لئے جائز نہیں ہے کہ مسلمان ناکام، غمگین، رنجیدہ، اپنے اور اپنے اطراف کے لوگوں کی زندگی کے بارے میں شک، ترس، بدگمانی سے کام لے، بلکہ اس کو پیغمبرؐ کی حدیث کے مطابق عمل کرنا چاہئے:'' من کان هینا لینا سهلا قریبا حرم الله علیه النار'' بیقہی، ۱۴۱۰:۶/۲۷۱، المنذری، ۱۴۱۷:۲/۳۵۴۔ جو شخص ملائم، آسانی کرنے والا، اور نرمی سے برتاو کرنے والا ہو خدا اس پر جہنم حرام کر دیتا ہے۔منذری نے یہ بھی کہا ہے کہ حاکم نے اس کی روایت کی ہے اور کہا ہے کہ مسلم شرط کے لحاظ سے یہ حدیث صحیح ہے:(ہناد، ۱۴۰۶:۲/۵۹۶) جو شخص آسان و نرم اور لوگوں سے نزدیک ہوگا خداوند عالم آتش جہنم کو اس پر حرام کر دیتا ہے۔ایک مسلمان کا آج کی زندگی سے نتیجہ نکالنا ایک اہم مسئلہ ہے۔ایک مسلمان کے لئے صحیح نہیں ہے کہ اپنے عصر کی زندگی کی مشکلات سے دوری اختیار کرے، اور پیش آنے والی مشکلات اور واقعیت سے دور بھاگے، اور گوشہ نشینی و تنہائی اختیار کرے بلکہ اس کو اپنی پالیسی بدلنی چاہئے۔اس سے ملاقات کے وقت لچک دار ذہنیت اور بلند ہوشی سے بہرمندہ ہو۔اور نور معرفت اور عفو و گزشت کی روشنی پر بھروسہ کرے اسی طرح اس کو چاہئے کہ ان تجویزات کے ساتھ جو زندگی کے تمام موضوعات میں جن میں ان کا اسے سامنا کرنا پڑے گا علمی گفتگو کے ساتھ پیش آئے ہمارے اس دور میں اسلامی فرقے اور مذاہب کے ماننے والے ایک دوسرے سے اچھا برتاو نہیں رکھتے۔یقینی طور پر ایسی چیز ایک مسلمہ شکست ہے۔جس سے نہ کوئی مشکل حل ہوسکتی ہے اور نہ کسی مطلوب نتیجہ تک رسائی ہوسکتی ہے۔

آ ج کے دور میں اسلامی مذاہب اور فرقے آپس میں ایک دوسرے سے برابرتاو کرتے ہیں، یقیناً ایسی چیز نہ کسی مشکل کو حل کرسکتی ہے نہ مطلوب نتیجہ تک پہنچ سکتی ہے۔ اور نہ کسی مقصد کو پورا کرسکتی ہے۔ اس وجہ سے میں ہر مسلمان کو خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو کسی بھی نظریہ فقہی سے ہو بڑے خلوص سے دعوت دیتا ہوں کہ وہ اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں سے گفتگو اور بحث ومباحثہ کرے تاکہ آپسی گفتگو کا سفر شروع کیا جائے۔ اختلاف نظریہ اصل کو ملیامیٹ نہیں کرتا۔ جو اپنوں سے گفتگو نہیں کرسکتا، وہ دوسروں سے بھی گفتگو نہیں کرسکتا، گفتگو کے قاعدہ کے لئے ضروری ہے اس طرح ہو ''ہمارا مذہب رجحان رکھتا ہے'' چونکہ اس میں خطا کا احتمال پایا جاتا ہے۔ اور دوسروں کا مذہب مرجوح ہے اس لئے کہ اس میں حقیقت کا احتمال پایا جاتا ہے۔ اس سنہرے اجتہادی قاعدہ کے سایہ میں تمام امت اسلامی سلامت رہے، جس کے مضمون کو خود پیغمبرؐ نے بیان کیا ہے: (**اذا حکم الحاکم فاجتهد فاصاب کان له اجران و اذا اجتهد فاخطا کان له اجر واحد**) اگر قاضی کسی حکم کا اجتہاد کرے اور وہ حکم درست ہو تو قاضی کو دو ثواب ملیں گیں، اور اگر اپنے اجتہاد کے حکم میں اشتباہ کرے تو اس کو ایک ثواب ملے گا، اس مطلب کو نیشا پوری نے بیان کیا ہے ابن صاعد بھی فرماتے ہیں اگر قاضی قضاوت کرے اور اس کا اجتہاد مطابق باواقع ہو اس کو دو ثواب ملے گا۔ اور اگر اپنے فیصلہ میں خطا کرے تو اس کو ایک ثواب ملے گا۔ (دار قطنی ۱۴۰۱: ۳۲۴)۔

ان فقہی مسائل کا دقیق علاج موجودہ کجروی اور افکار ونظریات کی درستگی کے لئے (درست کرنے کی کوشش میں) لگے رہنا اسلام کے سمجھنے میں پوشیدہ ہے۔ جو خوشامد پسندی کو دور کرنے اور قلوب کو حق کے قبول کرنے کے لئے آمادہ کرنے، اور مذہبی تعصب کے دور کرنے نیز اس کے عمومی مقاصد اور اسلامی قانون گزاری کی روح سے غبار کو دور کرنے سے محقق ہوتا ہے۔ کیوں کہ آج کی دینی گفتگو مذاہب یا اس گروہ سے جس سے وہ وابستہ ہے کو نظرانداز کرتے ہوے عمومی مصلحت کے تحقق کے لئے اسلامی تحقیق وبررسی کے دائرہ کے اندر شرعی اولویت وبرتری کی درجہ بندی کی ضرورت ہے تاکہ اس کا عمدہ مقصد یعنی امت اسلامی کی مشکلات کی شناخت کرنا اور لچک دار روش

کے ساتھ اس کی تحقیق کرنا اور مناسب راہ حل پیدا کرنے کے لئے کوشاں رہنا حاصل ہو سکے۔

اسلامی فرقوں اور مذاہب کے پیرووں کے درمیان گفتگو ان بڑے مشکل مسائل کے بارے میں ہو، جن سے امت اسلامی کا سامنا ہے۔ ایسی گفتگو جزئیات سے متعلق فقہی کشمکشوں سے خالی خصوصی مہارت کے ساتھ مختلف علمی آراء و نظریات کی تدوین کی بنیاد پر ہونی چاہئے۔ اور اس قاعدہ پر ہماہنگ ہو کہ نظریاتی اختلاف اصل قضیہ کو منتفی نہیں کرتا، اس وجہ سے اس روش کے ساتھ تمام فقہی مذاہب کے درمیان مناسب روابط قائم ہوں گے اور ایک با مقصد گفت وشنود کی ضمانت بنیں گے۔

د۔ فقہی اجتہاد باہم قریب ہونے کا ذریعہ نہ کہ ٹکراو کا آلہ

کچھ لوگ گمان کرتے ہیں کہ اجتہاد کی وجہ سے شرعی مسائل میں اختلاف اور کثرت آراء امتِ اسلامی کی پراکندگی اور بکھراؤ کا سبب بنتی ہے، درحالیکہ ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ احکام کے درمیان تفاوت کا پایا جانا متون کے نہ ہونے یا موجودہ متون کے سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے ہونے سے کسی قسم کی گھبراہٹ یا اس کے انجام سے کسی قسم کا خوف نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ ہم کو ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ حق حاصل ہے کہ ہم مطلق عقلی آزادی اور فکر کی پختگی سے بہرہ مند ہوں۔ تاکہ ہمیشہ نئے پن اور تبدیلی کے اسباب اور زندگی کے جدید مسائل کے ساتھ فقہی اور شرعی احکام کی ہمراہی میں زمانے کے وقائع بہرہ مندر ہیں۔

وہ بات جو اس معنی کی تاکید کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت میں اجتہاد ایک مطلق اور آزاد نیا کام نہیں جیسا کہ بہت سے علوم و معارف اور دوسرے انسان افکار میں پایا جاتا ہے بلکہ ایک ترسیم شدہ روش اور ایک مشخص پروگرام پر تعہد کرنا ہے جس پر امت کے تمام فقہاء اور مجتہدین اصولی اور بنیادی مسائل میں متفق الرای ہیں۔ حقیقت میں اجتہاد الٰہی حکم کی جستجو سے بالاتر کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ حکم جس کے لئے اس نے اپنی کتاب میں اپنے پیغمبر حضرت محمدؐ پر وحی نازل کر کے اپنے بندوں کو مخاطب قرار دیا ہے اور ان سے مانگ کی ہے کہ وہ اس کے پابند

رہیں۔اجتہاد مشخص نہج اور علم وسائل سے انجام پاتا ہے کہ کسی شخص کو خواہ کسی بھی مقام پر ہو حق حاصل نہیں ہے کہ اس کو نظر انداز کردے یا خود کو اس سے آزاد کر لے، اس بنا پر اجتہادی میدان محققین کے مقابلہ میں متون کی تفسیر اور ان پر قیاس کے معین قواعد اور ثابت اصول رکھتا ہے، اس طرح سے کہ اجتہاد توافق اور نزدیک ہونے کا سبب بنے، اختلاف اور پراگندگی کا سبب نہ بنے۔

خلاف واختلاف

فرعیات میں اختلاف ہونا انسانی ضرورتوں میں شامل ہے جنھیں نہ تو ختم کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی روکا جا سکتا ہے اور اس سے امت اسلامی کے لئے یا ان کے درمیان اتحاد کے حق میں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے ۔لوگ آپس میں متحد اور اپنی صفوں میں ہم آہنگی قائم رکھنے کے ساتھ نظریاتی اختلافات کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ہاں جس چیز سے خطرہ محسوس کیا جاسکتا ہے وہ خلاف ورزی میں پنہاں ہے نہ کہ اختلاف نظر میں، اور یہ بھی واضح ہے کہ خلاف ورزی اور اختلاف نظر کے درمیان بڑا فرق پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ علماء وفقہاء نے شرعی مقاصد کو محقق کرنے اور حق تک رسائی کے لئے آپس میں اختلاف کیا ہے جس کا سرچشمہ کتاب خدا کے مطالب کو اپنی عقل وفکر کے مطابق درک کرنا ہے۔علماء وفقہاء کے درمیان یہ اختلاف احتمالی معانی ومطالب، مسائل اجتہادی، اور استدلال کے درمیان رونما ہوا ہے یہ اختلاف اس لئے نہیں واقع ہوا ہے تا کہ ایک دوسرے کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جائیں اور ایک دوسرے کی تردید وتکذیب کریں یہ اختلاف غیر عمدی اور سمجھ ودرک کے تفاوت کی وجہ سے ہے جو کبھی بھی مسلمانوں کے درمیان جدال ونزاع کا باعث نہیں ہوتا ہے۔

اگر اصل لفظ اختلاف وخلاف مادہ'' خلف'' سے ہو تو اس پر غور وفکر کر کے ان دونوں کے معنی میں کیا تفاوت پایا جاتا ہے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، کیونکہ خلاف سے مراد'' مخالفت'' خلاف ورزی، نافرمانی اور احکام کے اجراء سے باز رہنا ہے اس سلسلہ میں خدا کا ارشاد ہے:''**فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبھم**

فتنة او یصیبهم عذاب الیم''(نور/۶۳)(وہ لوگ ہوشیار رہیں جو عذاب خدا کی مخالفت کرتے ہیں کہ فتنہ میں مبتلا ہو جائیں یا دردناک عذاب میں سے دوچار ہو جائیں)۔قرآن نہیں کہتا کہ''**یختلفون فی امره**''اس کے حکم وامر میں اختلاف کرتے ہیں۔کیونکہ اختلاف سے مراد نظریات اور آراء میں تفاوت واختلاف ہے اسی طرح خدا کا یہ کلام:''**وما انزلنا علیک الکتاب الا لتبین لهم الذی اختلفوا فیه**''(نحل/۶۴)ہم نے قرآن مجید کو آپ پر نازل نہیں کیا ہے مگر یہ کہ ان کے نظریات کے اختلاف کو واضح وروشن کردیں۔اسی طرح اللہ کا یہ ارشاد کہ:''**کان الناس امة واحدة فبعث الله النبیین مبشرین و منذرین و انزل معهم الکتاب بالحق لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیه**''(بقرہ/۲۱۳)لوگ ایک جماعت تھے خدا نے پیغمبروں کو بشیر ونذیر بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ برحق کتاب نازل فرمائی تاکہ لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہوں ان کا فیصلہ کریں۔انھیں مقامات میں سے ایک مقام پر حضرت عیسیٰ کی زبان سے خدا کا یہ کلام ہے ارشاد ہوتا ہے:''**ولما جاء عیسیٰ بالبینات قال قد جئتکم بالحکمة و لابین لکم بعض الذی تختلفون فیه**''(سورہ زخرف/۶۳)جس وقت حضرت عیسیٰ آشکار اور واضح دلائل لیکر آئے تو انھوں نے فرمایا: میں تمھارے لئے حکمت لایا ہوں تاکہ تمھارے لئے ان بعض چیزوں کو کہ جن کے درمیان تم اختلاف کرتے ہو واضح کردوں۔قرآن مجید نے ان آیتوں میں اختلاف کو نظریاتی اختلاف اور درک وفہم کا تفاوت جانا ہے اور اسے خلاف یا مخالفت نہیں شمار کیا ہے۔

فقہائے امت جس وقت آپس میں نظریاتی اختلافات پیدا کرتے ہیں اسے خدا کی اپنے بندوں پر عطاو نعمت گردانتے ہیں اور اسے عقل وفکر کی پختگی واستواری کی ایک قسم سمجھتے ہیں۔بشرطیکہ محکم دلیل اور قابل قدر برہان و حجت پر قائم اختلاف نظر ہو امام شافعی کہتے ہیں: خدائے متعال نے اپنے بندوں کو عقلیں عطا کردیں تاکہ فروق و اختلافات کو درک کریں اور انھیں دلیل کی بنیاد پر راہ حق پر لگائیں۔ابن حزم کہتے ہیں: اگر صحابہ کے درمیان اختلاف صحیح ہوتو ان کے بعد آنے والوں پر اظہار نظر کرنے سے مانع ہونا جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس مسئلہ میں اختلافی

نظریہ پر منتہی ہونے والے اجتہاد سے ممانعت کی جا سکتی ہے اگر کوئی شخص ایسی دلیل پیش کرے کہ جس کا نتیجہ صحابہ کے نتیجہ سے فرق رکھتا ہو تو کوئی حرج و منع نہیں رکھتا ہے (ابن حزم ۱۴۰۵: ۲۱)۔

اصول دین کے تحفظ کے ساتھ فروع میں اختلاف، دلوں میں اختلاف، صفوں میں انتشار اور فتنہ و فساد پر ختم نہیں ہوتا ہے۔ تمام مجتہدین کی کوشش قانون گزار (خدا) کے مقصود و مطلوب کو حاصل کرنا ہوتی ہے۔ ہر چند کہ اس کے مقصود کو حاصل کرنے میں فقہاء کے طرز و اسلوب عمل گونا گوں ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اجتہادی مسائل میں ان کے درمیان دوستی و محبت نمایاں ہے کیونکہ سارے مجتہدین قانون گزار (خدا) کے مقصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور روش کا فرق طرز عمل کا تفاوت ان کے آپسی تعلقات کو متاثر نہیں کرتا۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے احترام کا قائل ہوتا ہے اور ہمیشہ ان کی زبانوں پر یہ جملہ ہوتا ہے استنباط و اجتہاد میں ہم ایک دوسرے سے اختلاف نظر ضرور رکھتے ہیں لیکن ہمارے دلوں میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت اسلامی کے گزشتہ فقہاء مجتہدین ایک دوسرے کے ساتھ اچھے اخلاق اور مناسب دوستی کے ساتھ ملاقات کرتے تھے حضرت علیؑ سے عثمان کے بارے میں یہ روایت نقل ہوئی ہے: ''**اتقوا الله ايها الناس و اياكم في الغلو في عثمان و قولكم حراق المصاحف ، فو الله ما حرقها الا على ملأ منا اصحاب محمد صلى الله عليه وسلم** ''(قرطبی، ۱۳۷۲ھ، ۱: ۵۴)۔ ''اے لوگو! خدا کا تقویٰ اختیار کرو عثمان کے بارے میں غلو کر کے نہ کہو کہ اس نے مصحفوں (قرآنوں) کو جلایا ہے خدا کی قسم اس نے ہم اصحاب رسول خداؐ کی موجودگی میں مصحفوں کو نذر آتش کیا ہے '' (الخلال، ۱۴۱۰، ۲: ۴۲۶)۔ نیز روایت میں وارد ہوا ہے کہ حضرت علیؑ، طلحہ و زبیر کے قتل پر غمگین ہوئے اور فرزند صفیہ (زبیر) کے قاتل کو جہنم کی بشارت دی اور جب طلحہ مارا گیا تو امام نے فرمایا: ''**عزيز علي يا ابا محمد ! ان اراک مجندلا في الاودية و تحت نجوم السماء الى الله اشكو عجري و بجري**'' اے ابو محمد! میرے لئے بڑا سخت ہے کہ میں تمھیں صحرا میں آسمان کے ستارے کے نیچے قتل کیا ہوا دیکھ رہا ہوں میں اپنے غم و اندوہ

کا شکوہ خدا کی بارگاہ میں کرتا ہوں (المزی ۱۴۰۰/۱۹۸۰:۱۳/۴۲۰)۔

ابن عباس، فرائض اور میراث جد سے متعلق بہت مسائل میں زید سے اختلاف نظر رکھتے تھے آپ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: کیا زید کو خدا کا خوف نہیں ہے کہ پوتے کو دادا کی جگہ قرار دیتے ہیں اور دادا کو باپ کی جگہ قرار نہیں دیتے؟ مسئلہ عول کے سلسلہ میں ابن عباس کہتے ہیں: مجھے یہ پسند ہے کہ میں اور وہ لوگ جو کہ فریضہ کے سلسلہ میں مجھ سے اختلاف نظر رکھتے ہیں ایک جگہ جمع ہوتے اور اپنے ہاتھوں کو رکن (ستون) کعبہ کے اوپر رکھ کر دعا کرتے کہ خداوند متعال جھوٹوں پر لعنت کرے (عبدالرزاق، بی تا، ۱۰/۲۵۵)۔ اس اختلاف کے باوجود شعبی کہتے ہیں: زید بن ثابت اپنی سواری پر سوار ہونا چاہ رہے تھے عبداللہ بن عباس ان کے پاس آئے اور سواری کی لگام تھام لی زید نے ان سے کہا: اے رسول خداؐ کے چچا زاد بھائی یہ کام نہ کریں ابن عباس نے جواب دیا ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اپنے علماء کے ساتھ اسی طرح کا سلوک کریں۔ زید نے کہا آپ مجھے اپنا ہاتھ دکھلایئے۔ پھر زید نے ابن عباس کا ہاتھ تھام لیا اور اس کا بوسہ دیا اور بولے: پیغمبر خداؐ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم ان کے اہل بیت کے ساتھ اسی طرح کا سلوک کریں (المناوی ۱۳۵۶:۵/۳۸۲)۔

احمد بن حنبل، امام شافعی اور ان کے ماں باپ کے لئے دعائے خیر کیا کرتے تھے عبداللہ بن احمد حنبل نے باپ سے پوچھا: شافعی کس قسم کے آدمی تھے؟ میں دیکھتا ہوں کہ آپ ان کے لئے بہت دعا کرتے ہیں امام احمد نے کہا: اے میرے بیٹے امام شافعی، لوگوں کی دنیا و آخرت کے لئے سورج کے مانند تھے تم ان دو چیزوں کو مدنظر رکھو، کیا ان کا کوئی بدل اور جانشین کوئی ہے؟ (الذہبی، ۱۴۱۳:۱۰/۴۵)۔

ان بزرگواروں کے آپس میں بلند اخلاق اور عالی آداب کے سلسلہ میں روایت ہے کہ امام شافعی نے امام ابوحنیفہ کی مسجد میں نماز پڑھی اور ابوحنیفہ کے احترام میں نماز کے اندر قنوت کو ترک کر دیا اور بسم اللہ آہستہ سے پڑھی ابوحنیفہ ان کے اصحاب اور شافعی بھی اہل مدینہ کے مالکیوں کے علماء کے پیچھے نماز پڑھتے تھے جب کہ وہ لوگ

نماز میں بسم اللہ نہ بلند آواز سے اور نہ ہی آہستہ پڑھتے ہی نہیں تھے۔ ابو یوسف نے رشید کے پیچھے نماز پڑھی لیکن رشید نے ایسا نہیں کیا امام مالک نے اسے فتویٰ دیا کہ وضو نہ کرے اس کے باوجود ابو یوسف نے ان کے پیچھے نماز پڑھی اور اس کا اعادہ نہیں کیا۔ ان تمام باتوں کی روشنی میں اور اہل علم وفضیلت کے کردار کی بنیاد پر واضح ہوجاتا ہے کہ وہ لوگ شخصی مسائل یا دنیوی مقاصد کی خاطر آپس میں اختلاف نہیں کرتے تھے بلکہ وہ حقیقت کی تلاش میں ہوتے تھے اور حقیقت تک رسائی کے لئے چاہے مخالفین کے پاس ہو سعی وتلاش کرتے تھے اس بنا پر ان کا قصد برحق اور ان کا مقصد حکم شرعی کا حصول تھا۔

۲۔ فقہی آراء کا تعدد، رحمت اور سکون خاطر کا باعث

وہ بات جو یہاں پر کہی جاسکتی ہے یہ ہے کہ امت اسلامی کے درمیان مذاہب کا اختلاف ایک قسم کی فضیلت اور وسعت اس آسان اور درگزر کرنے والی شریعت میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے آنے والے تمام انبیاء علیہ السلام ایک شریعت اور ایک حکم کے ساتھ بھیجے جاتے تھے، یہاں تک کہ ان کی شریعت میں تنگی کی وجہ سے بہت سے ان فروع اور شاخوں میں کوئی انتخاب کا حق نہیں تھا کہ جن میں ہماری شریعت میں اختیار ہے۔

شریعت اسلامی میں عمومی متون اور کلی احکام ہیں اور جزئیات اور فروع کے حکم کو اس اجتہاد کے اوپر چھوڑ رکھا گیا ہے جسے نبی اکرمؐ نے معاذ کی مشہور ومعروف حدیث میں مقرر کیا ہے اور وہ اجتہاد قانون بنانے کے اصولوں میں سے ایک ہے اور اس سے حکم شرعی کو استنباط کیا جاتا ہے۔

اسی لئے اجتہاد اور وہ تعدد آراء جو اس کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہیں شریعت خاتم کی ضرورتوں میں سے ایک اور بندگان خدا کے لئے مظہر رحمت ہیں کہ جن میں کوئی ضرر ونقصان نہیں ہے ایک روایت کے مطابق رسول خداؐ فرماتے تھے: ''اختلاف امتی رحمۃ'' (النووی، ۱۳۹۲: ۱/۹۱) نووی اس حدیث کے اور اس سے مربوط

مضامین کے بارے میں کہتے ہیں: ''حظابی لحاظ سے دین میں اختلاف تین طرح کا ہے: ان میں سے ایک صانع اور اس کی وحدانیت کے اثبات کے بارے میں ہے کہ جس کا انکار کفر ہے، اور دوسرا حصہ اس کی صفات اور مشیت کے بارے میں ہے کہ جس کا انکار بدعت ہے، اور تیسرا موضوع احکام اور فروع سے مربوط ہے کہ جس میں احتمال وجوہ پائے جاتے ہیں اور خدائے تعالیٰ نے اسے علماء کے لئے ایک رحمت وکرامت قرار دیا ہے۔'' اختلاف امتی رحمۃ'' کی حدیث کا مطلب بھی یہی ہے (وہی حوالہ: ۹۲)۔

ابن قدامہ اپنی کتاب ''المغنی'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: ''خدا نے اپنی عفو ورحمت سے اس امت کے گزرے ہوئے لوگوں کو عالم ودانشمند قائد قرار دیا، ان کے ذریعہ اسلام کی بنیادوں کو بنایا اور احکام کے مشکلات کو ان کے ذریعہ روشن اور واضح کر دیا ان کے نظریوں کو توافق، حجت قاطع اور ان کے نظریوں میں اختلاف ایک پھیلی ہوئی رحمت تھا'' (ابن قدامہ، ۱۴۰۵: ۱/۱۷)۔ ابن تیمیہ نے بھی کہا ہے: ''کسی نے اختلاف کے بارے میں ایک کتاب لکھی احمد نے اس سے کہا: اس کتاب کا نام اختلاف نہ رکھو، اس کا نام سعۃ رکھو'' (الحرانی، بی تا: ۳/۷۹)۔

اس معنی ومفہوم پر تاکید کے مقصد سے فقہاء نے چند ضابطہ، حکم اور اصل کا تذکرہ کیا ہے کہ جس میں تمام نظریوں سے فائدہ حاصل کیا گیا ہے اور کسی ایک خاص مکتب یا مذہب کے نظریوں پر اکتفا نہیں کی گئی ہے ان میں سے سب سے اہم احکام اور ضوابط یہ ہیں:

۱۔ قائد کا اپنے مخالف علم کو پھیلنے سے نہ روکنا: مسلمان قائد کو حق نہیں ہے کہ لوگوں کو اس علم کے پھیلانے سے روکے جو اس کے نظریہ یا مذہب کے مخالف ہے، بلکہ اس کا فریضہ ہے کہ ہر مسلمان کو اپنا طریقہ چننے میں آزاد چھوڑ دے۔ ابن عباس اور ابن عمر نے عمر کی رائے کے خلاف حج تمتع کے بارے میں فتویٰ دیا اور حنیفہ اور کئی صحابہ نے اکٹھا ہو کر عثمان کی رائے کے خلاف، عرفہ میں نماز پوری پڑھنے کی رائے دی۔

۲۔ ایک دوسرے کی نیت پر تہمت نہ لگانا: چاہے آپ کا مخالف آپ کے نزدیک حق کا مخالف ہو، آپ کو

اس کی نیت پر تہمت نہیں لگانا چاہئے وہ مسلمان جو قرآن اور سنت پر ایمان رکھتا ہے مفروضہ یہ ہے کہ اجماع امت سے باہر نہیں ہے اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اخلاص اور عقیدت رکھتا ہے اور حق کی طرف متمایل ہے۔ آپ بھی اسی بنیاد پر اس کے ساتھ مناظرہ کیجئے اور اس کے بارے میں اچھا نظریہ قائم کیجئے۔

۳۔ اپنے مخالف سے حق کو قبول کرنا حق اور بافضیلت ہے: جب کسی مومن پر حق واضح ہو جائے تو اسے چاہئے کہ اسے قبول کرلے اور اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ حق کو رد کردے، اس لئے کہ حق کو رد کرنے کا سرانجام کفر ہوسکتا ہے جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: ''**لا تماروا فی القرآن فان المراء فیه کفر**'' (ہیثمی، ۱۴۰۷: ۱/۱۵۷)۔ (قرآن کے بارے میں لڑائی جھگڑا نہ کرو اس لئے کہ اس کے بارے میں لڑائی جھگڑا کرنا کفر ہے)۔ اس جگہ پر ممارات کا معنی لڑائی جھگڑا اور دلالت کو باطل کے ذریعہ ختم کرنا ہے اس لئے کہ یہ چیز خدا کو جھٹلانا اور اس کے حکم کو رد کرنا ہے نہ کہ مخالف کا جھٹلانا۔

۴۔ مخالف کو اس کی رائے میں فاسق اور بدعت گزار نہ سمجھنا: جائز نہیں ہے کہ مخالف پر منفی چیزوں کی تہمت لگائی جائے یا اسے برا بھلا کہیں یا اسے فاسق سمجھا جائے اور اگر کوئی ایسا کام کرے تو وہ بدعت گزار اور اجماع صحابہ اور سلف صالح کی رہنمائیوں کا مخالف ہوگا۔ ابن تیمیہ کہتے ہیں: تمام صحابہ اس بات پر متفق ہیں کہ اختلافی مسائل میں ہر گروہ دوسرے گروہ کے اجتہادی نظریہ کو قبول کرلے، جیسے عبادات اور نکاح، ارث وہبہ وسیاست وغیرہ کے مسائل میں۔ عمر نے پہلے سال میں مشترک مسئلہ کے بارے میں عدم تشریک کی رائے دی اور دوسرے سال میں ایک پہلے جیسے واقعہ کے بارے میں تشریک کی رائے دی جب ان سے اس بارے میں سوال ہوا تو انھوں نے جواب دیا: وہ جواب اس دن کی قضاوت تھی اور یہ جواب ہماری آج کی قضاوت ہے (البھوتی، ۱۴۰۲: ۱/۳۱۲)۔

ذہبی، امام محمد بن نصر مروزی کے حالات کی ترجمانی میں کہتے ہیں: اگر ہم ہر اس قائد کے خلاف قیام کریں جس کی غلطیاں اپنے اجتہاد میں جزئی مسائل میں درگزر کرنے کے قابل ہوں، اور اسے بدعت گزار سمجھیں

اور اسے تبعید کر دیں تو ایسی صورت میں ہمارے لئے نہ ابن نصیر سالم بچے گا اور نہ ابن مندہ اور نہ وہ لوگ جو ان سے بڑے ہیں۔ خدا لوگوں کے لئے حق کی طرف راہنما اور ارحم الراحمین ہے اور ہم ہویٰ و ہوس اور سخت مزاجی سے اس کی پناہ مانگتے ہیں (سیر اعلام النبلاء: ۱۴/۶۴۰)۔

۵۔ اجتہادی نظریہ قبول کرنے کے لئے لوگوں کو مجبور نہ کرنا: ایک مجتہد یا عام قائد کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اپنے نظریہ اور اجتہاد کو قبول کرنے پر مجبور کرے۔ اس لئے کہ جو بھی ایسا کر رہا ہے وہ گشائش اور وسعت کو تنگ کر رہا ہے اور کوشش کر رہا ہے کہ اسلام کو ایک سمت اور ایک فہم کی طرف لے جائے۔ اسلام کو ایک ایسے تنگ دائرے میں قرار دینا جس میں صرف ایک مذہب، ایک فکر یا ایک خاص مکتب کی گنجائش ہو اسلام کے حق میں ایک جرم ہے۔ اسی لئے امر بمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے علماء نے کہا ہے کہ اس طرح کے اجتہادی مسائل قابل انکار نہیں ہیں اور کسی کو حق نہیں ہے کہ لوگوں کو اس کی پابندی پر مجبور کرے، لیکن حجت اور علمی برہان کے ذریعہ، اس کے بارے میں بول سکتا ہے اور وہ لوگ جن کے لئے ان دو قول میں سے کسی ایک کی صحت ثابت ہوگئی ہو، وہ اس کی تبعیت اور پیروی کر سکتے ہیں اور ان لوگوں پر کوئی حرج نہیں ہے جو دوسرے قول کی تقلید کریں۔

بہت سے گزشتہ مجتہدین سے نقل ہوا ہے کہ وہ ان اختلافی مسائل کا انکار نہیں کرتے تھے جو اجتہاد کے ذریعہ حاصل ہوئے تھے۔ امام احمد بن حنبل سے روایت ہے کہ ایک فقیہ لوگوں کو ایک مذہب کی پیروی کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا (ابن تیمیہ، ۱۴۱۳: ۴/۵۶۷)۔ نووی نے بھی کہا ہے: مفتی یا قاضی کو حق نہیں ہے کہ اس پر اعتراض کرے جو اس کی مخالفت کرے اور اس کی بات نص، اجماع یا روشن قیاس کے خلاف نہ ہو (النووی، ۲/۲۴)۔

قاسم بن محمد سے نماز پڑھانے والے کے پیچھے حمد و سورہ آہستہ آواز کے ساتھ پڑھنے کے بارے میں سوال کیا گیا اس نے جواب دیا: اگر پڑھو تو اس کام میں تم نے رسول اللہ کے اصحاب کو اپنا نمونہ اور اسوہ قرار دیا ہے جب یہی بات عبداللہ بن عمرو سے پوچھی گئی تو کہا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ باہر نکلے اور ہم میں

سے بعض روزہ سے تھے اور بعض کا روزہ نہیں تھا، نہ روزہ رکھنے والے نے روزہ دار پر اعتراض کیا اور نہ روزہ دار نے روزہ نہ رکھنے والے کی عیب جوئی کی (روایت بزار اور حسن اسناد کے ساتھ)۔ ابو موسی سے بھی نقل ہوا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے ہم میں سے بعض روزہ سے تھے اور بعض نہیں تھے، نہ روزہ دار نے روزہ خوار کی عیب جوئی کی اور نہ روزہ خوار نے روزہ دار کی ۔ (الہیثمی :۳/۱۵۹)۔

اگر ہم چاہیں کہ اسلامی مذاہب کے درمیان تقریب کی روش کو اجتہاد کے راستے سے اس تحقیق میں اشارہ کیئے گئے افکار اور اطلاعات کی بنیاد پر معین کریں، تو اس مسئلہ کو ایک ایسے علمی سسٹم کی ضرورت ہے جو امت کے علماء و مبلغین کی طرف سے ہو چاہے جس مذہب کے بھی ہوں:

۱۔ مفہوم اور جگہ کے لحاظ سے مسلمان، وحی الہی اور بشری فکر کے درمیان فرق پر، اسلامی قانون بنانے کے دو بنیادی منبع کے عنوان سے توجہ کریں، اس لئے کہ وحی الہی وہ مقدس دین ہے کہ جس کے متون پر خدشہ کا اظہار یا اعتراض نہیں کیا جا سکتا، جب کہ بشری افکار انسان کے لئے وحی سمجھنے کا ذریعہ ہیں اسی بنیاد پر جو کتاب وسنت کے موافق ہو وہ شرعی لحاظ سے قابل قبول ہے اور جو کتاب وسنت کے مخالف ہو وہ شرعی لحاظ سے قابل قبول نہیں ہے۔

اس مسئلہ کو مورد توافق مسائل پر عمل کرنے کی ایک عمومی کوشش کی ضرورت ہے اور تمام مذاہب کے مورد توافق مسائل زیادہ ہیں۔ اسلامی مذاہب کے درمیان مشترک مسائل بہت زیادہ ہیں، چاہے اصول عقائد میں اور چاہے قانون بنانے، اخلاق، مفاہیم اور اسلامی کلچر میں، ہم کو چاہئے کہ ان جگہوں پر ایک دوسرے کو معاف کر دیں جہاں ہمارے نظریوں میں اختلاف ہے جیسے قانون بنانے میں اور جزئی و تفصیلی احکام میں کہ جو موضوعی اور علمی بنیادوں پر مستحکم ہیں اس لئے کہ ہم نے رائے اور فتوی میں اختلاف کو اس لئے قبول کیا ہے کہ شرعی لحاظ سے کوئی بھی رکاوٹ، نظریہ اور اجتہاد کے اختلاف کے بارے میں موجود نہیں ہے، بلکہ وہ کشمکش، جھگڑا اور اختلاف جو کہ ضعف امت کا باعث ہو اور دین کو تفرقہ میں مبتلا کر دے اور اس کی وحدت کو پراکندہ کر دے، مردود سمجھی گئی ہے اور اس سے

منع کیا گیا ہے البتہ ایسی چیز بشری افکار میں موجود نہیں ہے جو کہ صحیح شریعت کی ثابت تکیہ گاہوں کا سہارا لئے ہوئے ہو۔

چونکہ اجتہاد ایک قسم کی بشری فکر ہے جو کہ اصول شرع اور اس کے احکام کے ذریعہ ضابطہ مند اور وحی الٰہی کو سمجھنے کی ایک قسم ہے، تو والا مقام علماء و مفکرین کو چاہئے کہ اسے ربط اور نزدیکی ایجاد کرنے کا وسیلہ بنائیں نہ کہ ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراؤ اور فرار کا وسیلہ بن جائے۔ اسی بنا پر ایک نظریہ پر تعصب اور سختی کے ساتھ اصرار نہیں کرنا چاہئے یا ایک اسلامی فکر کو دوسرے اسلامی نظریہ یا فکر یا اجتہاد کے خلا میں استعمال نہیں کرنا چاہئے جب تک کہ وہ دو فکریں اور دو نظرئے اور دو اجتہاد ''وحی'' سے دو طرح کے اسلامی مفہوم ہیں اور جب تک کہ طرفین منضبط اور شرعی اجتہاد کے احاطہ میں ہیں۔ اسی لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں: اگر قاضی ایک حکم کو اجتہاد کے ذریعہ حاصل کرے تو اگر وہ اپنے اس حکم میں صحیح فیصلہ رکھتا ہو تو اسے دو ثواب ملیں گے اور اگر وہ غلط فیصلہ کر رہا ہو تو ایک ثواب سے بہرہ مند ہوگا۔ (صحیح بخاری: ۶/۲۶۷)۔

۲۔ ضروری ہے کہ مسلمانوں کے درمیان اختلاف اور خلاف میں فرق کیا جائے خلاف کا معنا مخالف اور عصیان اور اوامر الٰہی بجالانے سے سرپیچی کرنا ہے جو کہ مخالف فریقین میں دشمنی اور جنگ کا باعث ہوتا ہے، لیکن اختلاف یعنی نظریہ میں اختلاف یعنی ایک چیز کے شرعی حکم تک پہنچنے کے لئے ایک گروہ کا دوسرے گروہ سے کینہ یا دشمنی کے بغیر اس کے درک و فہم میں فرق رکھنا ۔

اسی لئے فرعی مسائل میں اختلاف، وحدت اصول پر پابندی کے ساتھ، دلوں میں اختلاف اور صفوں میں تفرقہ پیدا ہونے کا باعث نہیں ہوگا اور فساد و بے عدالتی کے لئے راستہ نہیں کھلے گا اسی بنیاد پر، اجتماعی مسائل میں دوستی اور مودت کی مثالیں ظاہر ہوئی ہیں۔ اس لئے کہ تمام مجتہدین قانون بنانے والے کی خواہش کی تکمیل چاہتے ہیں، اور مقصد تک دسترسی کے لئے ان کا اختلاف ان کے درمیان روابط پر اثر گزار نہیں ہوتا بلکہ ان میں سے ہر

ایک دوسرے گروہ کی قدر کرتا ہے یہاں تک کہ کہا جاتا ہے اگرچہ ہمارے حاصل کئے گئے نتیجوں میں اختلاف ہے لیکن ہمارے دل ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اسی لئے دوسروں کی تکفیر اور انھیں فاسق سمجھنے کے کلچر سے اسلامی معاشرے میں پرہیز کرنا چاہئے۔ تکفیر اور تفسیق کا کلچر ایک ایسا کلچر ہے جو کہ باہر سے اسلامی فکر میں داخل کیا گیا ہے اس لئے کہ ایک مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کی تکفیر کرے یا اسے فاسق سمجھے، مگر یہ کہ وہ دین کے امور میں سے کسی ایک کا اصرار کے ساتھ انکار کرے اسی لئے ہم اس مسئلہ میں ایمان و کفر کے مرحلہ سے صواب و خطا کے مرحلہ تک، اور تفسیق و بدعت گزاری کے مرحلہ سے راجح و مرجوح کے مرحلہ تک تبدیلی چاہتے ہیں۔ اس طرح اسلامی فکر کو موضوعیت ملے گی اور عقلانیت حاصل ہوگی۔

۳۔سکون سے بات چیت کرنے کے کلچر کو اسلامی مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان رائج کرنے پر توجہ دینی چاہئے، اس لئے کہ اسلام اور اس کے احکام کے بارے میں گفتگو کرنے والے فریقین جو کہ اسلامی فقہی مذاہب کے پیروکار ہیں، ان کو درک کرنا چاہئے کہ حقیقی اتحاد مختلف تفاسیر اور نظریوں میں اختلاف کے مخالف نہیں ہے۔ تاریخ نے صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان بہت سے مسائل میں نظریوں کے اختلاف کو بیان کیا ہے جو کہ قرآنی متون اور نبوی احادیث میں تھے اسی طرح تاریخ نے تابعین اور ان کے تابعین اور مختلف مذاہب کے قائدین کے درمیان اختلاف کو بیان کیا ہے جو کہ بغیر جھگڑے یا ایک دوسرے کی توہین کے تھے۔ نظریہ میں اختلاف اصل بات کو فاسد اور خراب نہیں کرتی وہ اصل جس کے مطابق حرکت کرتے ہیں ثابت کرتی ہے کہ ''ہمارا مذہب اس لئے ارجح اور بہتر ہے کہ اس میں خطا کا احتمال پایا جاتا ہے لیکن دوسروں کا مذہب اس لئے مرجوح اور کمتر ہے چونکہ اس میں صواب محتمل ہے''۔

گفتگو ہی دوسروں تک افکار کو منتقل کرنے میں اور ان تک اطلاعات پہنچانے میں سالم منطق ہے دوسروں کی باتیں سننا اور ان کے نظریوں سے باخبر ہونا اور سب سے بہترین اور نزدیکی نظریوں کی پیروی کرنا دلیل و

برہان کے ساتھ اور مخالفین کی توہین نہ کرنا ہی وہ چیز ہے کہ جس کی طرف قرآن کریم ہمیں دعوت دیتا ہے: ''**قل لا تسئلون عما اجرمنا ولا نسئل عما تعملون** ''، '' کہو کہ تم سے اس جرم کے بارے میں جو کہ ہم نے انجام دیا ہے سوال نہیں کیا جائے گا، ہم سے بھی ان کاموں کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا جسے تم نے انجام دیا ہے''۔

قرآن کریم نے مقابل کے گروہ کے احساسات کی رعایت کی ہے اور یہ نہیں کہا ہے ''**ولا نسال عما تجرمون** '' (ہم سے تمھارے جرم کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا) ہر چند یہ جملہ کے قرینہ اور ترتیب سے مناسبت رکھتا ہے، بلکہ کہا ہے: ''**ولا نسال عما تعملون** '' (ہم سے تمھارے کاموں کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا) اور یہ مقابل کے گروہ کا احترام ہے۔ اس آیت میں جس گفتگو کی بات چل رہی ہے اس کا خطاب غیر مسلمین سے ہے، اب اگر یہ گفتگو دو مسلمان گروہ کے درمیان ہو اور ان دلیلوں کے ساتھ ہو جن پر سب مسلمان حکم شرعی تک پہنچنے کے لئے ایمان رکھتے ہیں تو کیا حالت ہوگی؟

۴۔ اسلامی معاشروں کو قبول کر لینا چاہئے کہ نظریوں کا تعدد اور احکام فقہی میں اختلاف امت کے لئے وسعت اور رحمت ہے، نہ یہ کہ ان سے انتقام لینے اور شکنجہ دینے کا وسیلہ ہو اسی بنا پر مذاہب میں اختلاف شریعت سمحہ و سہلہ میں امت کے لئے ایک فضیلت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے آنے والے انبیاء ان میں سے ہر ایک خاص شریعت وحکم کے ساتھ مبعوث ہوتے تھے لیکن ان کی شریعت میں تنگی کی وجہ سے بہت سے فروع میں کہ جن کے لئے ہماری شریعت میں تخییر اور انتخاب موجود ہے ان شریعتوں میں اختیار نہیں تھا۔

اسلامی شریعت میں عام متون اور کلی احکام ہیں اور جزئیات اور فروع کا حکم اس اجتہاد کے عہدہ پر چھوڑ دیا گیا ہے جس کے صحت کی نبی اکرمؐ نے تائید کی ہے۔ نبی اکرمؐ نے معاذ کی مشہور حدیث میں اجتہاد کو شریعت کے ان اصولوں میں سے بیان کیا ہے کہ جن کے ذریعہ شرعی حکم کو استنباط کیا جاتا ہے اسی لئے اجتہاد اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی تعدد آراء شریعت خاتم کی ضرورتوں میں سے ایک اور بندوں کے لئے رحمت کا ایک مظاہرہ ہے کہ

جس کا کوئی ضرر و نقصان نہیں ہے۔ یہاں تک کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے: ''اختلاف امتی رحمة '' (شرح النووی ۹۱/۱۱:)۔ نظریوں میں میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔

۵۔ ہمارے دین نے اعتقادات کی توہین ہونے کے ڈر سے بے ادبی کو منع کیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: '' **ولا تسبوا الذین یدعون من دون الله فیسبوا الله عدوا بغیر علم** '' (انعام ۱۰۸) (ان لوگوں کو گالی نہ دو جو غیر خدا کو بلاتے ہیں اس لئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی دشمنی اور نادانی کی وجہ سے خدا کو گالی دیں)۔ اب خود مسلمانوں کے درمیان کیسا برتاؤ ہونا چاہیئے؟ بیشک اگر ایسی صورت میں مذاہب کے پیروکار اپنا کنٹرول کھودیں گے تو توافق وتقریب کے خلاف ایک فضا حاکم ہوجائے گی اور وہ ہمارے مقصد کے لئے نقصان دہ ہوگی۔

بے شک سب سے بڑی ذمہ داری اس بارے میں علماء ومبلغین اور تقریب کی دعوت دینے والوں پر ہے کہ وہ لوگوں سے کہیں کہ اجتہاد ایک شرعی حکم ہے اور نظریوں میں اختلاف متعدد دلائل اور مفاہیم ومدارک میں موجود فرق کے باوجود ایک طبیعی مسئلہ ہے۔ البتہ اس مسئلہ کو علماء اور فقہاء سمجھتے ہیں اس لئے کہ وہ ایک جہت سے انبیاء کے وارث، اسلام کی طرف دعوت دینے والے علمدار، اور نسلوں کی ترتیب کرنے والے ہیں اور دوسری جہت سے ان بنیادوں اور احکام سے زیادہ باخبر ہیں جنھیں تقریب کام میں لاتی ہے۔

منابع و مآخذ

قرآن کریم

۱۔ ابن ابی شیبہ، عبداللہ بن محمد، **مصنف**، تحقیق کمال یوسف الحوت، الریاض، مکتبۃ الرشد، چاپ اول، ۱۴۰۹ق۔

۲۔ ابن تیمیہ، ابوالعباس احمد عبدالحلیم، **شرح العمدہ فی الفقہ**، تحقیق سعود صالح العطیشان، الریاض، مکتبۃ العبیطان، چاپ اول، ۱۴۱۳ق۔

۳۔ ابن تیمیہ، ابوالعباس احمد عبدالحلیم، **الفتاویٰ**، تحقیق عبدالرحمٰن محمد عاصم، نشر مکتبۃ ابن تیمیہ۔

۴۔ابن حجر، ابوالفضل احمد بن علی، **فتح الباری (شرح صحیح البخاری)**، تحقیق محمد فؤاد عبدالباقی ومحبّ الدین الخطیب، بیروت، دارالمعرفہ،۱۳۷۹ق۔

۵۔ابن حزم، ابومحمد علی بن احمد بن حزم اندلسی، قاہرہ، **الاحکام فی اصول الاحکام**، دارالحدیث، چاپ اول۔۱۴۰۴ق۔

۶۔ابن حزم الظاہری، علی بن احمد بن سعید، **النبذة الکافیة**، تحقیق محمد عبدالعزیز، بیروت، دارالکتب العلمیة، چاپ اول ،۱۴۰۵ق۔

۷۔ابن قدامہ المقدسی، عبداللہ بن احمد، **المغنی**، بیروت، دارالفکر، چاپ اول،۱۴۰۵ق۔

۸۔ابن قیم الجوزیہ، محمد بن ابی بکر دمشقی، **اعلام الموقعین عن رب العالمین**، تحقیق طہ عبدالرووف سعد، بیروت، دار الجیل۱۹۷۳م۔

۹۔ابن کثیر، **البدایة والنہایة**، مصر، مکتبة المعارف،۱۹۶۶م۔

۱۰۔ابن ہمام الصنعانی، عب الرزاق، **مصنف**، تحقیق حبیب الرحمٰن الاعظمی، بیروت، المکتب الاسلامی، چاپ دوم، ۱۴۰۳ق۔

۱۱۔ابوزہرة، محمد، **اصول الفقہ**، قاہرہ دارالفکر العربی، ۱۳۷۷ق/۱۹۵۸م۔

۱۲۔الاحسان المجددی، محمد عمیم، **قواعد الفقہ**، کراچی، دارالصدف، چاپ اول، ۱۴۰۷ق/۱۹۸۶م۔

۱۳۔الاشقر، عمر سلیمان، **تاریخ الفقہ الاسلامی**، کویت، مکتبة الفلاح، چاپ سوم، ۱۴۱۲ق/۱۹۹۱م۔

۱۴۔البخاری، محمد بن اسماعیل، **صحیح البخاری**، تحقیق مصطفی دیب البغا، بیروت، دار ابن کثیر، چاپ سوم، ۱۴۰۷ق/ ۱۹۸۷م۔

۱۵۔البدری، محمد عبدالمہدی، **القرآن الکریم**، تاریخہ وعلومہ، دبی دارالقلم، چاپ اول، ۱۴۰۴ق/۱۹۸۴م۔

۱۶۔البوطی، محمد سعید رمضان، **فقہ السیرة**، دمشق، دارالفکر۔

۱۷۔البھوتی، منصور بن یونس بن ادریس، **کشاف القناع عن متن الاقناع**، تحقیق ہلال مصیلحی، بیروت، دارالفکر، ۱۴۰۲ ق۔

۱۸۔البیہقی، ابوبکر احمد بن حسین، **سنن البیہقی الکبری**، تحقیق محمد عبدالقادر عطا، مکتبة مکة المکرّمة، دار الباز، ۱۴۱۴ق/ ۱۹۹۴م۔

۱۹۔الترمذی،محمد بن عیسی،**سنن الترمذی**،تحقیق احمد شاکر، بیروت، دار احیاء التراث العربی۔

۲۰۔الخضری بیک،محمد،**اصول الفقہ**، بیروت، دار احیاء التراث العربی، چاپ ہفتم، ۱۴۰۵ق/۱۹۸۵م۔

۲۱۔الخلال، ابوبکر احمد بن محمد ہارون بن یزید، **السنۃ**، تحقیق عطیۃ الزہرانی، الریاض، دار الرایۃ، چاپ اول ۱۴۱۰ق۔

۲۲۔الدارقطنی، ابوالحسن علی بن عمر، **سنن الدارقطنی**، تحقیق السید عبد اللہ ہاشم یمانی المدنی، بیروت، دار المعرفۃ، ۱۳۸۶ق/۱۹۶۶م۔

۲۳۔الذہبی، ابوعبداللہ محمد بن احمد بن عثمان الذہبی، **سیر اعلام النبلاء**، تحقیق شعیب الارناؤوط و محمد نعیم العرقوسی، بیروت، مؤسسۃ الرسالۃ، چاپ نہم، ۱۴۱۳ق۔

۲۴۔الشافعی، محمد بن ادریس، **الرسالۃ**، تحقیق احمد شاکر، قاہرہ، ۱۳۵۸ق/۱۹۳۹م۔

۲۵۔الشوکانی، محمد بن علی، **فتح القدیر**، بیروت، دار الفکر۔

۲۶۔الشیبانی، عبدالرحمٰن بن علی، **تیسیر الوصول الی جامع الاصول**، قاہرہ، مؤسسۃ عیسی البابی الحلبی۔

۲۷۔القرطبی، محمد بن احمد بن ابی بکر، **الجامع لاحکام القرآن**، تحقیق احمد عبدالعلیم البردونی، القاہرہ، دار الشعیب، چاپ دوم، ۱۳۷۲ق۔

۲۸۔القشیری، مسلم بن الحجاج، **صحیح مسلم**، تحقیق محمد فؤاد عبدالباقی، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔

۲۹۔المزی، یوسف بن الزکی عبدالرحمٰن، **تھذیب الکمال**، تحقیق بشار عواد معروف، بیروت، مؤسسۃ الرسالۃ، چاپ اول، ۱۴۰۰ق/۱۹۸۰م۔

۳۰۔المناوی، عبدالرؤوف، **فیض القدیر**، مصر، المکتبۃ التجاریۃ الکبری، چاپ اول، ۱۳۵۶ق۔

۳۱۔النمری، یوسف بن عبداللہ بن عبدالبر، **التمہید**، تحقیق مصطفی بن احمد العلوی، المغرب، طبع وزارۃ الاوقاف و الشؤون الاسلامیۃ، ۱۳۸۷ق۔

۳۲۔النووی، ابوزکریا یحیی بن شرف الدین، **شرح النووی علی صحیح مسلم**، بیروت، دار احیاء التراث العربی، چاپ دوم، ۱۳۹۲ق۔

۳۳۔الہیثمی، علی بن ابی بکر، **مجمع الزوائد ومنبع الفوائد**، **القاہرہ**، دار الریان للتراث، بیروت، دار الکتاب العربی، ۱۴۰۷ق۔

۳۴۔بیہقی، احمد بن الحسین، **الاعتقاد**، تحقیق احمد عصام الکاتب، بیروت، دار الآفاق الجدیدۃ، چاپ اول، ۱۴۰۱ق۔

۳۵۔بیہقی، احمد بن الحسین، **شعب الایمان**، تحقیق محمد السعید بسیونی زغلول، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، چاپ اول،

۱۴۱۰ق۔
۳۶۔خلاف،عبدالوھاب،**اصول الفقہ**،کویت،دارالقلم،چاپ ہفدہم،۱۴۰۸ق/۱۹۸۸م۔
۳۷۔زیدان،عبدالکریم،**الوجیز فی اصول الفقہ**،بغداد مکتبۃ القدس،و بیروت،مؤسسۃ الرسالۃ ۱۴۰۵ق/۱۹۸۰م
۔
۳۸۔سجستانی،سلیمان بن اشعث،**سنن ابی داود**،تحقیق محمد محی الدین عبدالحمید،بیروت،دارالفکر۔
۳۹۔شوکانی،محمد بن علی،**ارشاد الفحول**،بیروت،دارالفکر،چاپ اول،۱۴۱۲ق/۱۹۹۲م۔
۴۰۔عبدالحمید،محسن،**الفکر الاسلامی (تقدیمہ وتجدیدہ)**،العراق،دارالانبار۔
۴۱۔عبدالعظیم بن عبدالقوی المنذری،الترغیب والترھیب المنذری،تحقیق ابراھیم شمس الدین،بیروت،دارالکتب
العلمیہ،چاپ اول،۱۴۱۷ق۔
۴۲۔عیسی،عبدالجلیل،**مالا یجوز الخلاف فیہ**،الکویت،دارالبیان،۱۳۸۹ق/۱۹۶۹م۔
۴۳۔قرضاوی،یوسف،**الاجتہاد فی الشریعۃ الاسلامیۃ**،کویت،دارالقلم للنشر والتوزیع،چاپ دوم،۱۴۱۰ق/۱۹۸۹
م۔
۴۴۔للشاطبی،ابراہیم بن موسی الغرناطی،**الموافقات**،تحقیق عبداللہ دراز،بیروت،دارالمعرفۃ۔
۴۵۔محمد بن حبان بن احمد التمیمی،**صحیح ابن حبان**،تحقیق شعیب الارناؤوط،بیروت،مؤسسۃ الرسالۃ،چاپ دوم،۱۴۱۴
ق/۱۹۹۳م۔
۴۶۔مختصر کتاب المؤمل لابن شمۃ،**مجموعۃ الرسائل المنیریۃ**،ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ،[بی تا]۔
۴۷۔ہناد بن یسری الکوفی،الزہد،تحقیق عبدالرحمٰن عبدالجبار الفریوانی،کویت،دارالخلفاء للکتاب الاسلامی،چاپ
اول،۱۴۰۶ق۔
۴۸۔یاقوت الحموی،**معجم البلدان**،نشر مطبعۃ الخانجی وشرکاءہ،چاپ اول۔

اتحاد کے علمبردار

پرچم دار اتحاد شیخ محمد حسین بن علی آل کاشف الغطاء

(۱۲۹۴ق۔۱۳۷۳/۱۸۷۷ء۔۱۹۵۴)

ترجمہ: سید نجیب الحسن زیدی

تقریب کے ہراول دستہ کو متعارف کرانا اس لئے ضروری ہے کہ فکر تقریب کے تار و پود میں اصلاحی تحریک نہاں ہے۔ اس طرح کی تحریکیں اگر چاہیں کہ اپنے راستہ کو بیداری کے ساتھ مسلسل طے کریں تو ہر چیز سے زیادہ اپنے گزشتہ کارناموں کی بازبینی کی ضرورت ہے اس صورت میں نہ صرف گزشتہ دور کے نتائج و آثار کی رونق اور تازگی کا رنگ پھیکا نہ ہوگا بلکہ اس دور میں انجام شدہ امور کا تسلسل بھی برقرار رہے گا اور جمود کے دلدل میں بھی نہیں دھنسے گا۔ فکر تقریب یا شعور ہم آہنگی کے ذریعہ یہ بات ممکن ہو جاتی ہے کہ ماضی کے بچے ہوئے علمی سرمایہ سے استفادہ کرتے ہوئے تحقیق کے نئے دریچوں کو کھولنے کی کوشش کے ساتھ ایک طرف تو گزشتہ دور کے لٹریچر کو بارور بنایا جائے دوسری طرف تقریب کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلہ میں شعور اتحاد کے فضا کو سازگار بنایا جا سکے اس شمارے میں تقریب کے ہراول دستہ کی دو اہم شخصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے ۱۔ شیخ محمد حسین بن علی کاشف الغطاء، ۲۔ شیخ محمد عبدہ۔

پیش نظر تحریر فکری تحریک کے ہراول دستہ سے متعلق ایسی شخصیت کے بارے میں ایک مختصر تعارف پر مشتمل ہے جس کی پوری زندگی امت اسلامی کے درمیان اتحاد کی مساعی سے عبارت تھی شیعہ اور اہل سنت کے مابین

اتحاد شیخ محمد حسین کے افکار کا ایک بنیادی اور نمایاں جزو ہے اس شخصیت کو متعارف کرانے کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ جامد فکر رکھنے والے دانشوروں کے برخلاف آپ کی کوشش یہ تھی کہ شیعہ اور سنی علماء ایک دوسرے کو بہتر طور پر پہچانیں اور ایک دوسرے کے مشترک اعتقادی اور سیاسی سرمایوں سے استعمار اور صہیونیت کے مقابلہ میں فائدہ حاصل کرسکیں.

شیخ محمد حسین کی سیاسی اور اور علمی شخصیت کا جائزہ لینے سے قبل آل کاشف الغطا خاندان کی اہم شخصیتوں کا ایک مختصر تعارف مورد گفتگو شخصیت کی پرورش کے تربیتی علمی اور سیاسی ماحول کو بہتر طور پر روشن کرسکتا ہے۔

خاندان کاشف الغطاء:

۱۳ اویں/۱۴ اویں/صدی ہجری کی دہائیوں میں آل کاشف الغطاء عراق کے شیعہ امامی علماء کا محترم خاندان ہے .اس خاندان کے افراد کا تعلق قبیلہ بنی مالک سے ہے اور یہ بیان ہوا ہے کہ انکا سلسلہ نسب [۱] امام علی علیہ السلام کے صحابی مالک بن حارث بن عبد یغوث جو کہ اشتر نخعی (متوفی ۳۷ ہجری) کے نام سے معروف ہیں تک پہنچتا ہے اسی بنا پر ان لوگوں کو مالکی بھی کہا گیا ہے.

ان کے آباواجداد شہر حلہ کے اطراف میں ''جناجیہ'' یا ''جناجیا'' یا ''قناقیا'' نامی دیہاتوں میں رہتے تھے ۱۲/ہجری کے آخری عشرے میں اس خاندان کے اسلاف اور بزرگوں میں ایک بزرگ یعنی ''خضر بن یحیی'' (متوفی ۱۱۸۰) نے نجف کی طرف کوچ کیا، اسی سبب سے آل کاشف الغطاء کے افراد نے ''جناجی'' نام سے بھی شہرت پائی [۲] آل کاشف الغطاء سے اور بڑے معروف علماء سامنے آئے ہیں جن میں سے ہر ایک اپنے زمانہ میں عراق ایران اور بعض دیگر اسلامی ممالک اور شیعی معاشروں میں اہم علمی اور سیاسی آثار کا سر چشمہ رہے ہیں خاندان کاشف الغطاء کی علمی اور سیاسی شخصیات حسب ذیل ہیں جنھیں ان کے سال وفات کے ساتھ ذکر کیا جارہا ہے۔

۱۔ ''جعفر بن خضر بن یحیی جناجی حلی نجفی'' معروف بہ شیخ جعفر کاشف الغطاء

۱۱۵۶-۱۲۲۷ھ:

آل کاشف الغطاء کے معمار جو کہ جعفر کبیر اور شیخ مشائخ کے نام سے بھی معروف ہوئے ۔آپ کو اپنی مشہور فقہی کتاب ''کشف الغطاء'' لکھنے پر کاشف الغطاء کا لقب ملا .آپ ایک پارسا مجتہد ہونے کے ساتھ ساتھ اہل عبادت اور ایک بیدار مرجع تھے سعی مسلسل کے بعد بھی نہ تھکنے والے مجاہد تھے .وہابیوں کے نجف پر حملہ کے وقت آپ کے مجاہدات نیز روسی دراندازوں کے مقابل آپ کی رشادتیں جنھوں نے ایران کے بعض حصوں پر قبضہ جمالیا تھا تاریخ میں محفوظ ہیں.

۲۔موسی بن جعفر کاشف الغطاء ۱۱۸۰-۱۲۴۳ھ :

فقیہ،اصولی،ادیب،شاعر،اور شیخ جعفر کاشف الغطاء کے بڑے فرزند جو کہ اپنے والد بزرگوار کی حیات میں تدریس،فتوی نیز لوگوں کے مسائل حل کرنے اور عام لوگوں کی جوابدہی میں اپنے والد کے شریک کار تھے.بعض علماء نے آپ کی علمی اور فقہی دقت نظری کو آپ کے والد کی نظر پر فوقیت و ترجیح دی ہے ۔۳ آپ کے بے شمار شاگردوں نے جن میں آپ کے بھائی شیخ محمد حسن آل کاشف الغطاء (۱۲۰۱-۱۲۶۲ھ کے ساتھ شیخ محمد حسن معروف بہ صاحب جواہر متوفی ۱۲۶۶ھ بھی شامل ہیں، نے اپ کے دروس سے استفادہ یا ہے۔

۳۔علی بن جعفر آل کاشف الغطاء ۱۱۹۷-۱۲۵۳ھ:

فقیہ ادیب،شاعر،آپ کو عظیم الشان علمی منزلت کی بنا پر ''محقق ثالث'' بھی کہا گیا ہے۔آپ کے بھائی شیخ موسی کے انتقال کے بعد دینی مرجعیت آپ اور شیخ محمد حسن (معروف بہ صاحب جواہر متوفی ۱۲۶۶ھ) تک مشترکہ طور پر پہنچی۔

۴۔حسن بن جعفر آل کاشف الغطاء ۱۲۰۱-۱۲۶۲ھ :

فقیہ،اصولی،ادیب وشاعر،آپ نے اپنے والد کے پاس مقدمات کی تعلیم حاصل کیا اس کے بعد آپنے

اپنے بھائی شیخ موسی، سید محمد جواد عاملی اور دیگر اساتید کے دروس میں شرکت کی اور مختلف علوم میں مہارت حاصل کی لیکن آپ کی زیادہ تر شہرت فقہ میں تھی انوارالفقاہہ نامی کتاب میدان فقاہت میں آپ کے تسلط کی دلیل ہے .

۱۲۵۸ھ میں جب نجیب پاشا حاکم عثمانی نے شورش کی اور کربلا پر قبضہ کے بعد ۱۲۵۹ھ میں نجف پر حملہ کا قصد کیا تو آپ نے ہی تدبیر وذکاوت کے ذریعہ اس کو ہدف تک پہنچنے سے باز رکھا۔

۱۲۶۰ھ میں جب نجیب پاشا نے مختلف اسلامی فرقوں کے علماء اور فقہاء کو بغداد بلایا تا کہ سید علی محمد باب شیرازی (متوفی ۱۲۶۶ھ کے عقاید اور اس کے دعوں کے سلسلہ میں اظہار نظر کریں تو آپ شیعہ علماء کے ایک وفد کے ساتھ میٹنگ میں حاضر ہوئے اور جلسہ میں حاضر فقہا کے نظریات کے ہجوم کے درمیان آپ کے نظریہ کو قبول کیا گیا یہ امر خود آپ کے لئے اور شیعہ فقہاء کے لئے ایک بڑی کامیابی کے طور پر گردانا گیا اور وسیع پیانہ پر اس کی شہرت ہوئی۔[۴]

۵۔مہدی بن علی آل کاشف الغطاء ۱۲۸۹۔۱۲۲۶ھ:

فقیہ، اصولی، مرجع تقلید، ادیب، شاعر، نجف میں پیدا ہوئے اسلامی علوم کو اپنے والد ماجد اور اپنے چچا شیخ حسن اور بھائی شیخ محمد اور نجف کے دیگر علماء سے سیکھا اور درجہ اجتہاد پر فائز ہوئے. اپنے زمانہ میں فقہ واصول کے بر جستہ استادوں میں تھے شیخ مرتضی انصاری بہت سے شرعی وعرفی امور میں لوگوں کو آپ سے رجوع کرنے کو کہتے تھے شیخ انصاری کے انتقال کے بعد ایران، قفقاز اور عراق کے بہت سے شہروں کے عوام آپ کی تقلید کرتے تھے۔

اودھ ہندوستان کے موقوفات کی رقم نجف میں آپ ہی کے ہاتھوں تقسیم ہوتی تھی آپ نے نجف اور کربلا میں دو دینی مدارس کی بھی بنیاد ڈالی جن سے طلاب نے استفادہ کیا۔[۵]

۶۔عباس بن علی آل کاشف الغطاء ۱۳۱۴۔۱۲۴۲ھ:

فقیہ، اصولی، ادیب، شاعر، نجف میں پیدا ہوئے بچپنے میں ہی والد کا انتقال ہو گیا چنانچہ اپنے چچا شیخ محمد

حسن اور اپنے بھائیوں کی زیر سرپرستی تربیت پائی۔ اپنے بھائی شیخ حبیب آل کاشف الغطاء متوفی ۱۳۰۷ھ کے انتقال کے بعد دینی ریاست کے عظیم مقام تک پہنچے۔ ''ہندیہ'' میں انتقال کیا اور نجف میں سپرد خاک ہوئے۔

۷۔ ''محمد بن علی آل کاشف الغطاء'' متوفی ۱۲۶۸ھ :

فقیہ، اصولی، شاعر، نجف میں پیدا ہوئے اپنے خاندان کے علماء سے علم حاصل کیا، اپنے چچا (صاحب انوار الفقاہہ) اور شیخ حسن (صاحب جواہر) کے انتقال کے بعد عراق کے کچھ شیعوں کے مرجع تقلید قرار پائے۔ ۱۳ رویں صدی ہجری کے بہت سے فقہا آپ کے شاگرد تھے اور ان میں سے کچھ لوگوں نے آپ سے اجازہ بھی حاصل کیا۔ آپ نے عثمانی حکام کے ذریعہ عوام کی مشکلات کے حل کے سلسلہ میں بھی بہت کوشش کی۔ ۶

۸۔ محمد رضا بن موسی آل کاشف الغطاء، ۱۲۹۷۔۱۲۳۸ھ:

فقیہ عالم نجف میں پیدا ہوئے مقدمات اور علوم عالیہ کو شیخ ابراہیم قطفان (متوفی ۱۲۷۹ھ، شیخ موسی خمایسی، شیخ احمد دجیلی، متوفی ۱۲۶۵ھ اور اپنے چچا شیخ حسن اور صاحب جواہر سے حاصل کیا۔ آپ نجف کے ایک داخلی جھگڑے کی بنیاد پر شہر چھوڑنے پر مجبور ہوگئے اور کاظمین چلے گئے ۳ سال وہاں سکونت کے بعد ۱۲۹۰ھ میں نجف واپس پلٹ آئے۔ ۷

۹۔ موسی بن محمد رضا آل کاشف الغطاء، ۱۳۰۶۔۱۲۶۰ھ:

فقیہ، ادیب۔ نجف میں پیدا ہوئے اور وہیں اپنے تعلیمی مراحل کو اپنے عصر کے علماء من جملہ شیخ محمد حسین کاظمی (متوفی ۱۳۰۸ھ کے پاس طے کیا پھر سامرا آگئے اور مرزا محمد حسن شیرازی کے درس میں شریک ہوئے۔ والد ماجد کی رحلت کے بعد ایک بار ۱۲۹۸ھ میں اصفہان کا سفر کیا اور اس کے بعد ۱۳۰۶ھ میں پھر ایران روانہ ہوئے اور تہران میں سفر کے دوران ہی دنیا سے رخصت ہوئے۔ ۸

۱۰۔ عباس بن محمد رضا آل کاشف الغطاء، ۱۳۲۳۔۱۲۵۳ھ:

فقیہ، اصولی، ادیب وشاعر۔ نجف میں پیدا ہوئے مقدماتی علوم کے مراحل کو طے کرنے کے بعد سامرا چلے گئے وہاں فقہ واصول کے دروس خارج کو شیخ مرتضی انصاری، مرزا حبیب اللہ رشتی، مرزای شیرازی اور اپنے چچا زاد بھائی شیخ مہدی آل کاشف الغطاء سے حاصل کیا اور درجہ اجتہاد پر فائز ہوئے آپ نے فقہ واصول کے موضوع پر متعدد آثار یادگار کے طور پر چھوڑے۔ فقہی اور اصولی مباحث کی تشریح کے عنوان سے کافی اشعار بھی آپ سے منسوب کئے جاتے ہیں ۔۹

۱۱۔احمد بن علی آل کاشف الغطاء، ۱۳۴۴۔۱۲۹۲ھ :

فقیہ و مرجع تقلید دروس عالی کی تکمیل کے لئے سامر کا سفر کیا اس کے بعد نجف واپس پلٹ آئے ایران کے انقلاب مشروطیت کے بعد ۱۳۲۴ھ میں اپنے استاد آخوند خراسانی کے مشروطیت کی حمایت کی بنا پر ان سے دور ہو گئے اور سید کاظم یزدی سے نزدیک ہو گئے جو مشروطیت کے مخالف تھے عمر کے آخری ایام میں سید یزدی کے انتقال کے بعد مراجع تقلید مس شمار ہوتے تھے مرزا نائنی اور سید ابو الحسن اصفہانی جیسے علماء کے باوجود ایران ، عراق اور افغانستان میں لوگ آپ کی تقلید کرتے تھے آخر نجف میں دعوت اجل کو لبیک کہی اور وہیں مدفون ہوئے۔

۱۲۔مرتضی بن عباس آل کاشف الغطاء، ۱۳۴۹۔۱۲۹۱ھ:

فقیہ، اصولی، متکلم، مصنف اور شاعر. نجف میں پیدا ہوئے علم اصول کو آخوند خراسانی (۱۳۲۹ھ) سے پڑھا اور فقہ کو محمد کاظم یزدی سے ، نثر واشعار کی صورت میں فقہ واصول کے موضوع پر متعدد آثار آپ نے چھوڑے ہیں آپ کے بعض آثا وہابیت کے شبہات کے جواب میں بھی ہیں۔۱۰

۱۳۔علی بن محمد رضا آل کاشف الغطاء، ۱۳۵۰۔۱۲۶۷ھ :

عالم، ادیب، مورخ وشاعر نجف میں پیدا ہوئے اور وہیں علمی مدارج طے کئے عوام کی اجتماعی مشکلات کو حل کرنے کے سلسلہ میں کافی جدوجہد کرتے تھے بغداد کے عثمانی حکام میں بھی اثر ورسوخ تھا سری پاشا بغداد کے

حاکم کے ساتھ بھی کہ جوادیبوں میں سے تھا اور ادب دوست بھی تھا آپ کی رفاقت تھی۔ آپ نے اس کے ذوق کی کافی تعریف بھی کی ہے۔ ۱۲۹۵ھ میں ایران کا سفر کیا اور ۷ سال تک ایران کے مختلف شہروں تہران، اصفہان، شیراز اور مشہد میں رہے اور ۱۳۰۲ھ کو نجف واپس آگئے۔ اسی طرح آپ نے شام، حجاز، مصر، اسلامبول اور ہند کے سفر بھی کئے آپ کی اہم کتاب الحصون المنیعہ فی طبقات الشیعہ ہے کتاب کا اصل خاکہ ۱۲ جلدوں پر مشتمل تھا لیکن ۷ جلد ہی پوری کر سکے آپ کی دوسری تالیف سمیر الحاضر وانیس المسافر ۵ جلدوں میں ہے جو کشکول کی شکل میں ہے ۔

۱۴۔ ہادی بن عباس آل کاشف الغطاء، ۱۳۶۱۔ ۱۲۸۹ھ :

فقیہ، مورخ، ادیب اور شاعر، نجف میں آنکھ کھولی فقہ واصول کو شیخ الشریعہ اصفہانی، سید محمد کاظم یزدی اور شیخ محمد طہ نجف (متوفی ۱۳۲۹ھ سے پڑھا۔ شعر وادب میں شہرت یہاں تک پہنچی کہ عراق کی ۱۴ ویں دہائی کی ادبی تحریک کے معماروں میں شمار ہوئے۔ آپ نے مختلف اور متنوع آثار میراث میں چھوڑے ہیں جن کے بارے میں آقا بزرگ نے الذریعہ میں اشارہ کیا ہے ۔[11]

۱۵۔ محمد رضا بن ہادی آل کاشف الغطاء، ۱۳۶۶۔ ۱۳۱۰ھ :

فقیہ، ادیب، شاعر، نجف میں پیدا ہوئے ابتدائی علوم حاصل کرنے کے بعد فقہ واصول کو اپنے والد اور نجف کے دیگر علماء سے حاصل کیا ادب پر تسلط ہونے کی بنا پر آپ کے آثار مختلف مجلوں میں شائع ہوئے سرانجام بیروت میں انتقال کیا اور نجف میں مدفون ہوئے۔

اس خاندان کے علماء اور دانشوروں نے اجتماع اور سیاست کے میدان میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس خاندان کی سب سے پہلی شخصیت بیدار مرجع اور عزم پیہم رکھنے والے مجاہد آیہ اللہ شیخ جعفر کاشف الغطا کی تھی. آپ نے نجف پر وہابیوں کے حملہ کے وقت علاقہ کے کچھ علماء اور لوگوں کی مدد سے وہابیوں سے جنگ بھی کی. آیۃ اللہ شیخ جعفر نے ۱۲۱۵ھ میں کہ جب روس نے ایران کے کچھ حصوں پر ناجائز قبضہ کیا تو دراندازوں کے خلاف جہاد کا فتوی

بھی صادر کیا اور فتح علی قاچار کو اجازت دی کہ آپ کی طرف سے لوگوں کو فوج کی جانب سے جنگ کے لئے بلائے۔

اسی طرح آیۃ اللہ شیخ علی کاشف الغطاء (مورد گفتگو شخصیت کے والد ماجد) نجف کے ایک اور بیدار مجتہدوں میں تھے جنھیں رسمی طور پر قاہرہ میں تحقیقات اسلامی کی دوسری کانفرنس میں دعوت دی گئی .اس کانفرنس میں آپ کی تقریر کا موضوع فلسطین کا مسئلہ تھا اسی فرصت سے استفادکرتے ہوئے کہ یہ کانفرنس شہادت امام حسینؑ اور روز عاشور کے دنوں میں منعقد ہوئی تھی آپ نے قاہرہ میں تقریر کی اور یہ تقریر صوت العرب (عرب کی آواز) ریڈیو سے نشر ہوئی .عاشورا اور کربلا کے بارے میں اس عالم تشیع کے مایہ ناز مرجع کی تقریر کا نشر ہونا مصر میں مذہب شیعہ کی بے انتہا تاثیر کا سبب بنا اسقدر کے ایوبیوں کی حکومت کے بعد سے اس وقت تک ایسی تاثیر کا سابقہ نہیں تھا۔

اس خاندان کے دیگر افراد کا تفصیلی تعارف نظر انداز کرتے ہوئے فی الحال ہم کاشف الغطاء کی شخصیت اوران کی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں.

محمد حسین بن علی آل کاشف الغطاء، ۱۲۹۴۔۱۳۷۳ھ:

آپ فقیہ، اصولی، ادیب، محدث، مصنف، خطیب، شاعر اور آل کاشف الغطا جیسے مجاہد علماء میں سے ایک ہیں ۱۹۲۴ھ نجف میں پیدا ہوئے .مقدماتی علوم، ادبیات علم الاشکال، ریاضی واقلیدس کو سیکھنے کے بعد فقہ و اصول کے خارج کو سید کاظم یزدی اور شیخ آقا رضا اصفہانی و آخوند خراسانی سے پڑھا، علم کلام کو میرزا باقر اصطہباناتی (۱۳۲۶ھ) و شیخ احمد شیرازی اور شیخ محمد رضا نجف آبادی سے، علم حدیث کو حاج میرزا حسین نوری سے سیکھا اور خود بھی والا مقام فقہا اور علماء میں قرار پائے۔ دوران جوانی میں حکمت، فلسفہ اور عرفان کا رخ کیا اور اس میدان میں بھی اپنی معلومات کی قلمرو میں وسعت بخشی آپ خود اس بارے میں کہتے ہیں ”میں نے صدر المتالھین ملا صدرا کی تمام کتابوں کو مشاعر، عرشیہ اور شرح ہدایہ سے لیکر اسفار نیز شرح اصول کافی کو ماہر اساتید سے پڑھا“

اسی طرح آپ نے مولوی، جامی اور دیگر فارسی شعرا کا بھی مطالعہ کیا فارسی زبان سے آپ کی آشنائی

سبب بنی کہ فارسی کے عرفانی اشعار سے مانوس ہو جائیں لیکن اس کے بوجود آپ نے کبھی بھی عرب شعراء کے کلام سے غفلت نہ برتی.آپ ذوق شعری بھی رکھتے تھے نوجوانی کے زمانے میں اشعار بھی کہتے تھے ۔۱۸/سال کی عمر میں آخوند خراسانی اور سید کاظم یزدی کے دروس میں شرکت کی۔اس طرح کہ دونوں شخصیات کے درس میں آنے والے سب سے جوان شاگردوں میں شمار ہوتے تھے ۔۲۰/سال حصول علم کے بعد نقطہ اوج کو پہنچے۔اس کے بعد تدریس کے ذریعہ اپنی معلومات کو اپنے شاگروں تک منتقل کیا.

آپ کے درس میں جو کہ عموما نجف کی مسجد ہندی اور میرزاے شیرازی کی آرامگاہ پر تشکیل ہوتا تھا خاصی تعداد میں علماء اور طلاب شرکت کرتے تھے.آہستہ آہستہ آپ کی علمی شہرت کا دائرہ پھیلنے لگا اور ایک توانا مجتہد کے عنوان سے حوزہ علمیہ نجف میں سامنے آئے۔آپ کی تقلید کے سلسلہ میں لوگوں کا اصرار اس بات کا باعث بنا کہ آپ نے اپنے فتاوی کو آیۃ اللہ سید محمد کاظم یزدی کے فتاوی کے ذیل میں چاپ کیا۔کتاب عروۃ الوثقی پر لکھی گئی سیکڑوں شرحوں میں اس کتاب پر آپ کی شرح سب سے پہلی شرح شمار ہوتی ہے۔

آپ پر سید محمد کاظم یزدی کی نظر خاص تھی اور سید بہت سارے علمی اور فقہی سوالات کو آپ پر چھوڑ دیتے تھے کہ انکا جواب آپ دیں اپنے بھائی شیخ احمد (متوفی ۱۳۴۴ھ) کی رحلت کے بعد آیۃ اللہ سید ابوالحسن اصفہانی کی مرجعیت عام کے باوجود آپ مرجعیت کے عظیم مقام تک پہنچے ہندوستان،ایران،قطیف،افغانستان،مسقط،اور کچھ عراقی قبایل کے افراد آپ کی تقلید کرتے تھے۔

کاشف الغطاء کے فقہی نظریات:

کاشف الغطاء نے مجلۃ العدل نامی کتاب کے مطالعہ اور تجزیہ کے دوران، جو سلطنت عثمانی کا مدنی قانون شمار ہوتی تھی، یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ کتاب دراصل فقہی فتاوی پر مشتمل ہے لیکن حقوقی اور تعزیری مواد کے قالب میں تنظیم پائی ہے۔لہذا آپ نے فیصلہ کیا کہ ایک کتاب اسی روش پر لکھیں اس بارے میں آپ فرماتے ہیں:

''میں نے اس کتاب کا جوتر کوں (سلطنت عثمانی) کے زمانہ سے اب تک کے قانونی محکموں اور اداروں کے واحد قانونی متن کی حیثیت رکھتی تھی جائزہ لیا اور اس کے لئے تصحیح کو ضروری جانا۔ جیسا کہ اس کتاب کے طرز تحریر سے ہی معلوم ہے اسکا قانونی پہلو نمایاں حیثیت رکھتا ہے اور اسکو برتری حاصل ہے. اس کتاب کو فقہ قانونی یا قانون فقہی کا نام دیا جاسکتا ہے چنانچہ آپ نے تحریر المجلہ نامی کتاب لکھ کر اس کتاب پر تنقید کی اور فقہ شیعہ کا قانونی، تعزیری اور مدنی صورت میں تعارف کرایا یہ کتاب مجموعی طور پر ۵ جلدوں میں چاپ ہوئی اور قانون دانوں، وکیلوں قاضیوں اور عدالت کے کارندوں اور اہل کاروں کی طرف سے مورد استقبال قرار پائی۔

شیخ محمد حسین کی زیادہ تر فقہی جولانیاں اس مبنیٰ پر استوار تھیں کہ ان کے تمام نظریات اور فتاویٰ زمان و مکان کے تقاضوں اور اس کے شرائط سے مطابقت رکھتے ہوں آپ اجتہاد میں زمان و مکان کے رول اور اس سلسلہ میں فقیہ کی توجہ کے بارے میں فرماتے ہیں: آیا ایک چھوٹے سے محلّہ میں چند مساجد کی تعمیر صحیح کام ہے؟ کیا یہ کام اس بات کا باعث نہیں بنتا کہ لوگ مختلف جگہ بکھر جائیں اور مسجدیں خالی نظر آئیں۔ حتی بعض مساجد میں تالے پڑ جائیں؟ کیا اس صورت میں بھی مساجد کی تعمیر ثواب کی حامل ہے؟

اس سلسلہ میں آپ نے مراجع تقلید سے یہ درخواست کی کہ عوام کی اس سلسلہ میں راہنمائی کریں اور لوگوں سے بھی درخواست کی کہ مدرسہ، ہسپتال اور دیگر عام المنفعہ عمارتوں کی تعمیر میں حصہ لیں۔

کاشف الغطاء فقیہ کے اختیارات کے بارے میں فرماتے ہیں:

فقیہ لوگوں کے ان تمام کاموں پر ولایت رکھتا ہے جو اسلامی سماج اور اسلامی نظام کے لئے ضروری ہیں ولایت فقیہ کا دائرہ ان تمام موارد کو شامل ہے جو اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت کے قلمرو میں آتے ہیں۔

امام خمینی (رہ) ولایت فقیہ اور اس سلسلہ میں کاشف الغطاء کے عقیدہ کے بارے میں فرماتے ہیں'' جو ولایت پیغمبروں اور ائمہ علیہم السلام کے لئے ہے وہی فقیہ کے لئے بھی ثابت ہے ولایت فقیہ کا موضوع کوئی نئی چیز

نہیں ہے کہ جسے ہم نے پیش کیا ہو بلکہ یہ مسئلہ ابتداء سے بحث کا موضوع رہا ہے. مرحوم کاشف الغطاء نے بھی اس بارے میں بہت سے مطالب کو بیان فرما دیا ہے''

کاشف الغطاء فقیہ کو طبیعی ذخائر اور انفال میں واحد فیصلہ کا حق رکھنے والا مرجع سمجھتے تھے اسی طرح آپ جدید پیش آنے والے مسائل میں دوسروں سے جلدی فتوی دیتے تھے جعفر خلیلی، عراق کے مشہور صحافی اور مصنف کہتے ہیں: ''میں نے آیت اللہ سید ابوالحسن اصفہانی کی رحلت کی مناسبت سے ایک تقریر میں کہا'' سید ابوالحسن اصفہانی وہ پہلے مجتہد تھے کہ جنھوں نے حکم دیا کہ وہ عورت جسکے شوہر کو ۵/سال جیل کی سزا سنائی گئی ہے طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے خلیلی کہتے ہیں'' میں نے ان سے پوچھا آپ کے حکم کی فقہی دلیل کیا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا مجتہد قانون سازی کا حق رکھتا ہے۔

آپ کے اتحاد آفریں سفر:

شیخ محمد حسین دینی اور سیاسی معلومات کے حامل تھے. آپ اسلام کے جوہر دیانت سے بھی واقف تھے اسلامی امت کی گزشتہ تاریخ سے بھی آگاہ تھے اور اپنے عصر کے حکام اور موجودہ سیاست کو بھی جانتے تھے۔ آپ اسلام کی موجودہ صدی کے مصلحوں میں ہیں . اگر چہ آپ اسلامی بیداری کے ہراول دستہ کی ابتدائی تحریک میں شامل سید جمال الدین اسد آبادی اور شیخ محمد عبدہ اور اس تحریک میں شامل دیگر افراد سے متاثر تھے۔ لیکن آپ کے فکری عمق اور عصری مسائل اور سیاست سے آپ کی واقفیت، لہجہ کی صراحت، اور عملی شجاعت کے ساتھ فقہی مقام اور دینی مرجعیت نے آپکو ایک برجستہ خصوصیت عطا کی اور آپ کی اصلاحی تعلیمات کو کارساز بنا کر پیش کیا ۔

چنانچہ اس حالت میں بھی جب آپ ایک عالم دین کے فرائض انجام دے رہے ہوتے تھے اپنا وقت سیاسی اجتماعی مسائل اور مسلمانوں کو صہیونیت اور امپریلزم سے جنگ کرنے کی ضرورت سے آگاہ کرنے میں بھی صرف کرتے تھے۔

آپ کے مختلف اسلامی ممالک کے سفر امت اسلامی کی بیداری کا ایک عملی شیوہ ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے امور کی دیکھ ریکھ کے سلسلہ میں آپ کے خاص اہتمام کا ایک حصہ تھے۔

پہلی مرتبہ ۱۳۲۸ھ میں سنی دانشوروں سے گفتگو کے خیال سے اور شیعہ سنی اتحاد قائم کرنے کے سلسلہ میں حجاز کا سفر کیا"نزهة السمر و نهزة السفر" کتاب آپ کے حج کا سفرنامہ ہے اس کے بعد دمشق گئے۔ وہاں پر سنی علماء سے جہان اسلام کی مشکلات اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد کی ضرورت پر گفتگو کی۔ اس کے بعد بیروت کا سفر کیا۔ وہاں پر دو مہینہ رہے اور اس شہر کے علماء کے دیدار کے دوران وہاں پر اپنے بعض آثار چاپ کرنے میں کامیاب رہے۔ اسی طرح سے انھوں نے صیدا کا سفر کیا اور اس شہر میں تین مہینے کے قیام کے دوران سنی علماء جیسے شیخ سلیم بشری و شیخ محمد نجیب مطیعی (مفتی حقانیہ) سے ملاقات و گفتگو کی آپ نے لبنان چھوڑنے سے پہلے وہاں شادی کی اس کے بعد مصر کی طرف عازم ہوئے۔ اس ملک میں اہلسنت علماء سے گفتگو کی اور الازھر یونیورسٹی کے طالب علموں کے لئے جلسہ درس تشکیل دیا، قاھرہ کے چند کلیساؤں میں تقریر کی اور عیسائیت کے سلسلے میں اپنے عقائد کو"التوضیح فی بیان ماهو الانجیل و من هو المسیح" دوجلدی کتاب میں لکھا اور حضرت عیسیٰؑ و انجیل کے چہرہ پر پڑی خرافات کی گرد کو دور کیا۔

کاشف الغطاء نے ۱۳۳۱ھ کے ماہ صفر کے آخری ایام میں مصر چھوڑنے اور عراق واپس آنے کا ارادہ کیا، لیکن شیخ محمد نجیب نے درخواست کی کہ اپنا سفر ملتوی کردیں اور ربیع الاول کے مہینے میں ولادت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مناسبت سے مصر میں ہونے والے جشن میں شرکت کریں۔ آپ نے بھی اسے قبول کرلیا آپ کے تین سال کے سفر پر محیط یہ عرصہ ۱۳۳۲ میں پہلی عالمی جنگ کے آغاز پر اختتام پذیر ہوا۔ برطانیہ نے عراق کے بہت سے شہروں پر قبضہ کرلیا تھا اسی وجہ سے عراق واپس آئے اور محاذ جنگ کے پہلے خط (Freuntline) پر پہنچ گئے اور برطانیہ کے متجاوز فوجیوں سے جنگ کی۔

فلسطین کی اسلامی کانفرنس میں شرکت:

نجف میں سالوں سال قیام کے بعد ۱۳۵۰ھ کو اپنے ایک اور سفر میں اسلامی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے فلسطین گئے .اس کانفرنس میں جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی مناسبت سے علماء کی موجودگی میں بیت المقدس میں منعقد ہوئی ،سید حبیب عبیدی ، (موصل کے مفتی) سید محمد زیارہ (یمن) رشید رضا (شاگرد سید جمال الدین اسدآبادی اور تفسیر المنار کے مصنف) علامہ اقبال لاہوری جیسی شخصیات بھی حاضر تھیں .آپ نے جو کہ عراقی علماء کے وفد کے ساتھ اس کانفرنس میں حاضر ہوئے تھے مسجد الاقصی میں نماز پڑھی اور ہزاروں مسلمانوں نے جن میں کانفرنس کے مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے اراکین ومندوبین بھی شامل تھے آپ کی اقتدا کی۔

آپ نے اس کانفرنس کے بارہویں جلسہ میں ایک اثر انگیز تقریر کی جسے کانفرنس اور جہان اسلام میں مثبت پذیرائی ملی۔

آپ نے گزشتہ مسلمانوں کے حالات،مسلمانوں کی موجودہ دور کی زبوں حالی ان کے انحطاط اوران کے درمیان اتحاد کی ضرورت اور اختلافات سے پرہیز کے سلسلہ میں تقریر کی تھی۔

یہ تقریر پہلے قدس میں اس کے بعد دیگر اسلامی ممالک کے روزناموں اور اخبارات کی زینت بنی . بیروت کے فاروق اول کالج کے ایک استاد نے اپنی ''کتاب الاسلام بین السنه والشیعه ''میں آپ کی گفتگو کی تاثیر کے بارے میں لکھا:''اگر اس نئی تحریک کی برکات نہ ہوتیں تو کیا کسی کے لئے یہ تصور کرنا ممکن تھا کہ اہلسنت کے مختلف دھڑے کاشف الغطاء کی اقتدا کریں؟

کیا آپ یہ سوچ سکتے ہیں کہ ان کی کتاب ''الدعوۃ الاسلامیۃ''اس سے قبل کہ اسے شیعہ دانشور حضرات پڑھیں اہلسنت کے ہاتھوں میں ہو؟ کاشف الغطا ۱۵/دن فلسطین میں رہے اور انھوں نے کانفرنس میں موجود سنی شیعہ دانشوروں سے ملاقات کی ۔انھوں نے فلسطین کے مختلف شہروں کا سفر کیا اور وہاں کے علماء اور عوام سے ملاقات کی ان کو وحدت واتحاد کی دعوت دی.آپ نے اس طرح لوگوں کے قلوب کو تسخیر کرلیا تھا کہ اس کے بعد آپ کو

امام کاشف الغطا کہا گیا''

جی ہاں ! کاشف الغطاء کی اثر انگیز تقریر اس طرح علماء اور عوام کے درمیان مورد استقبال قرار پائی کہ آپ دلوں کے محبوب بن گئے کانفرنس میں حاضر دانشوروں نے آپ کی تقریر کے بعد سے جب تک آپ فلسطین میں رہے نماز جماعت اور جمعہ کو آپ ہی کی اقتدا میں پڑھا حتی وہابی، ناصبی اور خارجی علماء بھی آپ کی اقتدا کرتے تھے. آپ نے اسی سفر کے دوران (جو ۱۵دن تک جاری رہا) فلسطین کے دیگر شہروں جیسے حیفا، نابلس، یافا، کا دورہ کیا سفر سے واپسی پر عراق کے لوگوں نے آپ کا گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا ۔

آپ نے مسلمانوں کے سیلاب کے بارہ میں کہ جو بیت المقدس کی آپ کی تقریر سے وجد میں آ گئے تھے ۔مسجد کوفہ میں ایک تفصیلی تقریر کی یہ تقریر آپ کے تاریخی خطبوں میں شمار ہوتی ہے۔

آپ نے اپنی اس تقریر میں اسلام کی دیرینہ عظمت کی یاد دہانی کرائی اور مسلمانوں کی پسماندگی کے سلسلہ میں کچھ باتیں بیان کیں۔

آپ نے عراق میں دو سال قیام کے بعد ۱۳۵۲ھ میں پہلی بار ایران کا سفر کیا اور حضرت ثامن الائمہ امام رضاؑ کی زیارت سے مشرف ہوئے. آپ نے ایران کے اکثر شہروں جیسے کرمانشاہ، ہمدان، قم، تہران، شاہرود، مشہد، شیراز، خرمشہر، آبادان اور بوشہر کا دورہ کیا اور ہر جگہ لوگوں سے فارسی میں گفتگو کی اور انھیں بیداری اور استعمار سے مقابلہ اور جہاد کی دعوت دی. قم میں آپ بانی حوزہ علمیہ قم آیۃ اللہ شیخ عبدالکریم حائری یزدی کے مہمان ہوئے۔ آیت اللہ حائری نے آپ سے چاہا کہ ان کی جگہ حرم معصومہ میں امام جماعت کے فرائض ادا کریں۔ آپ نے اس بات کو قبول کرلیا اور نماز جماعت کے اختتام پر آپ نے تقریر کی .اس سفر کے بعد کہ جو تقریبا ۸/مہینہ جاری رہا۔ آپ بصرہ کے راستہ سے عراق واپس ہوئے. لیکناس کے بعد بھی ۱۳۶۶ھ اور تیسری بار ۱۳۶۹ھ، میں ایران کا سفر کیا جو بہت ساری برکتوں کا باعث ہوا۔

پاکستان کی اسلامی کانفرنس میں شرکت:

جمعیت اخوت اسلامی نے پاکستان میں ۱۳۷۱ھ کو دوسری اسلامی کانفرنس منعقد کی اور کاشف الغطاء سے اس کانفرنس میں شرکت اور تقریر کی درخواست کی ۔اس کانفرنس میں آپ کی تقریر کا ایک حصہ یہ ہے:

" میں نے بیس سال پہلے ایک جملہ کہا تھا جو ہر جگہ معروف ہوا. میں نے کہا اسلام دو بنیادوں پر استوار ہے کلمۂ توحید اور توحید کلمہ اسلام یکتا پرستی اور قانون کے سامنے تمام لوگوں کے برابر ہونے کا آئین ہے ۔

ابھی ہجری کی پہلی صدی ختم نہیں ہوئی تھی کہ مختلف مذاہب وجود میں آ گئے سب سے پہلا فتنہ جو دین کے قلب میں تیر کی طرح پیوست ہوا خوارج کا تھا، دین کے اصول وفروع میں اختلافات سامنے آنے لگے بادشاہوں اور سلاطین نے اختلافات کو اور ہوا دی ۔استعمار نے فرصت کو غنیمت جانا اور حد شکنی کا آغاز کر دیا۔مسلم ممالک ان کے چنگل میں آ گئے ۔ پاکستان کی تازہ حکومت اسلام کے نام پر وجود میں آئی پاکستان اسلام کا فرزند ہے ،اس کا بینادی قومی دستور العمل بھی قرآن اور سنت کی بنیاد پر ہونا چاہیے، پاکستان کی حکومت ہندوستان سے اسلام کے نام پر علیحدہ ہوئی اسی لئے میں نے فتوی دیا کہ پاکستان کی حکومت کی مدد کرنا تمام مسلمانوں پر واجب ہے ۔ہم خود کو مسلمان تو کہتے ہیں لیکن ہماری تاریخ عیسائی اور زرتشتی تاریخ ہے اتوار کے دن چھٹی ہوتی ہے اے مسلمانو! اپنی تمام طاقت کو یکجا کرو اس لئے کہ عالمی سیاست نے اسلامی اور عربی ممالک پر یلغار کی ہوئی ہے ابھی ایرانی حکومت خدا اس کی مدد کرے (مراد مصدق کی حکومت تھی) اس گندی سیاست کے چنگل اور اس کے ذریعہ ڈسے جانے سے نہیں نکل پائی ہے اور یہ اس وقت تک ہو بھی نہیں سکتا جب تک تمام لوگ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر ایک دوسرے کی مدد نہ کریں۔

کاشف الغطا ۴۰ دن پاکستان میں رہے اور اس دوران لاہور، راولپنڈی، کشمیر(مظفر آباد) اور پشاور کے لوگوں سے ملاقات اور گفتگو کی اور انھیں اتحاد کی دعوت دی۔

آپ کے اصلاحی نظریات اور فکری تحریکیں:

شیخ محمد حسین کے آثار میں مسلمانوں کے گزشتہ مفاخر اور ان کے قدیمی تمدن کی یادآوری کی گئی ہے اور ماضی کی ترقی کے رازوں اور آخری دہائیوں میں اسلامی امت کے انحطاط کی وضاحت کی گئی ہے۔ آپ کا نظریہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت سے نجات کا پہلا قدم حقیقی ایمان اور صدر اسلام کی خالص تعلیمات کی طرف ان کی بازگشت ہے ۔

اسی بنا پر آپ کی تحریروں اور تقریروں میں مسلمان فرقوں کے مابین اتحاد و ہم دلی کی دعوت بہت زیادہ نظر آتی ہے ان تمام باتوں کے باوجود آپ بھی اسلامی اتحاد کے دیگر منادیوں کی طرح اس سلسلہ میں کوئی واضح تفسیر یا تعریف بیان نہیں کرتے ہیں لیکن یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان آپ کی دعوت کا مثبت جواب دیں۔

آپ یہاں تک اسلامی اتحاد کے کردار کو اہمیت دیتے ہیں کہ صلیبی جنگوں، مغلوں کیا سلامی سلطنت پر حملہ اور مغربی استعمار کے جہان اسلام میں نفوذ کی علت مسلمانوں کے درمیان خوداعتمادی کے فقدان کو بیان کرتے ہیں۔

اسی بنا پر آپ کی شیعت کے دفاع کی کوشش (اصل الشیعہ واصولھا کی تالیف کے ذریعہ) شیعت کے تعارف اور دونوں مذاہب کے درمیان بدگمانی کے غبار کو ختم کرنے اور دو بڑے اسلامی مذاہب کے درمیان قربت پیدا کی خاطر تھی یہی وجہ تھی کہ دونوں ہی فرقوں کے علماء آپکو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے اور کبھی کبھی قدس کانفرنس کی طرح وہابی علماء بھی آپ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔

آپ کی اصلاحی طرز فکر کی ایک اور علامت استعمار اور صہیونیت سے مقابلہ کے لئے لوگوں کو دعوت دینا ہے .شیخ محمد حسین شہنشاہیت پرستی کی حقیقت کو اپنے زمانے میں پہچان چکے تھے اس سلسلہ میں ان کی آگاہی اور باخبری کا اندازہ امریکی کانفرنس میں ''بحمدون'' کو دئے گئے جواب سے لگایا جاسکتا ہے۔

۱۳۷۳ھ ۱۰/رجب ''مشرق وسطی کے دوستداروں نامی امریکی انجمن'' کے نائب رئیس گارلنڈ یویز ہیپکنز نے شیخ محمد حسین کو ایک خط لکھا اور ان سے درخواست کی اس کانفرنس میں کہ جو الحاد اور مادیت سے مقابلہ کے لئے اسلام اور مسیحت کے ایک دوسرے کے تعاون اور مشترکہ طور پر راہ حل کی تلاش کے سلسلہ میں دونوں ادیان کے کچھ دینی رہنماؤں کی شرکت سے ۱۸ شعبان کو اسی سال لبنان کے شہر بحمدوں میں منعقد ہونے والی ہے شرکت کریں تو آپنے اس درخواست کو قبول نہ کرتے ہوئے اس کانفرنس میں شرکت نہ کرنے کی علت ایک تفصیلی خط میں تحریر کی اور خط امریکہ بھیج دیا کہ جو بعد میں المثل العلیا نامی کتاب کی صورت میں سامنے آیا۔

آپ باوجود اس کے کہ مسلمانوں کو صدر اسلام کے ایمان کا احیاء کرنے کی ہمیشہ دعوت دیتے رہے اور مغربی استعمار سے مقابلہ کے لئے اس امر کو ضروری سمجھتے رہے اس بات پر بھی توجہ رکھتے تھے کہ قدیمی رجعت پسندی اور جدید استعمار سے نجات کا ایک راستہ اقتصادی توسیع اور جدید علوم وفنون میں مہارت ہے۔

مسجد جامع کوفہ میں فلسطین کانفرنس کے بعد آپ اپنی ایک تقریر میں فرماتے ہیں:

''مغرب مشرق کا مالک نہیں بنا مگر صنعت کے ذریعہ اور ثروت کے چشموں کو چوسنے کی بنا پر ہمارے دین نے تمام مفادات کو جو ثروت کے لئے مفید ہیں بیان کر دیا ہے اور اقتصادی برتری اور ترقی کو ہمارے گوش گزار کر دیا ہے۔''

دوران ضعیفی اور انتقال:

شیخ محمد حسین اپنی زندگی کے آخری لمحات تک مسلمانوں کو اتحاد اور اتفاق کی دعوت دیتے رہے آپ ۷۹ سال کی عمر میں بغداد کے کرخ ہسپتال میں بھرتی ہوئے انھیں ایام میں بحرین کے مختلف طائفوں اور قبایل (بظاہر شیعہ سنی) کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہو گئے. جب اس بات کی خبر آپ تک پہونچی تو اسپتال سے ہی بحرین کے مسلمانوں کے لئے ایک پیغام بھیجا اور ان سے اپنے جھگڑوں کو ختم کرنے کو کہا۔ اس پیام کے ایک حصہ میں آیا ہے کہ صہیونست آپس میں متحد ہیں لیکن مسلمان ایک دوسرے سے جدا ہیں اگر ایک صہیونست عراق میں بیمار ہو جائے

تو دوسرا چین میں اس کی خاطر محزون ہوتا ہے جان لو کہ اسلام کے دشمن شیعہ اور سنی کے درمیان جنگ کے شعلے بھڑکانا چاہتے ہیں۔

آپ اس پیام کے ذریعہ جس میں محبت اور رواداری کے اوپر تاکید کی گئی تھی بحرین کے آشوب اور جھگڑے کو ختم کرانے میں کامیاب رہے۔

کاشف الغطاء ایک ماہ کے قریب ہسپتال میں بھرتی تھے پھر ڈکٹروں کے اچھی آب و ہوا والے کسی علاقہ میں جانے کے مشورہ کی بنا پر کرمانشاہ اور خانقین کے درمیان ایک دیہات میں منتقل ہوئے اور آخر انجام ۱۵/ذی قعدہ ۱۳۷۳ھ کو کرند نامی کرمانشاہ کے علاقہ میں نماز صبح کے بعد طلوع آفتاب سے قبل آپ کی زندگی کا سورج گروب ہو گیا. آپ کا مطہر جنازہ کرند کے عوام کی تشیع جنازہ کے ساتھ نجف منتقل ہو گیا اور قبرستان وادی السلام میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا ۔آپ کی روح ہمیشہ شاد رہے اور آپ کی راہ ہمیشہ راہیان حق سے آباد رہے۔

....

حواشی و مصادر:

(۱) دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی جلد۲ ص ۱۰۰، و امین عاملی، اعیان الشیعہ، جلد۴، ص ۹۹ شمارہ ۳۰۰ بیروت ۱۴۰۷ھ اس اثر میں دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی سے کافی استفادہ کیا گیا ہے

(۲) امین عاملی وہی مدرک جلد۴ ص ۱۰۰

(۳) وہی مدرک، جلد۱۰، ص ۱۷۸، شمارہ ۵۹۵)

(۴) محمد حرز الدین، معارف الرجال، قم (۱۴۰۵، جلد۱ ص ۲۱۵ و ۲۱۶.

(۵) وہی مدرک جلد۳، ص ۹۷.

(۶) وہی مدرک جلد۲ ص ۳۵۶، ۳۵۸

(۷) وہی مدرک ص ۲۸۳ و ۲۸۴

(۸) وہی مدرک جلد۳، ص ۵۲

(۹) آقا بزرگ تہرانی، طبقات اعلام الشیعہ، جلد۱۳۔

(۱۰) حرز الدین معارف الرجال قم جلد۲ ص ۴۰۸)

(۱۱) امین عاملی، اعیان الشیعہ جلد۱۰، ص ۲۳۱، و آقا بزرگ تہرانی، الذریعہ الی تصانیف الشیعہ جلد۱ ص ۳۰۳

شیخ محمد عبدہ، اصلاح کے پرچم دار

(۱۲۶۶_۱۳۲۳)

ترجمہ: محمد باقر رضا

ولادت اور وفات

محمد عبدہ نے ۱۲۶۶ھ ق کو مصر کے شمال میں واقع صوبہ ''بحیرہ'' کے ذیل میں آنے والے شہر ''شبراخیت'' کے ''محلّہ نصر'' نامی چھوٹے سے اُس دیہات میں آنکھیں کھولیں جہاں دریائے نیل مڈیٹرین میں سرازیر ہو جاتا ہے۔ اور ۸/ جمادی الاولی ۱۳۲۳ھ سکندریہ میں واقع ''رمل'' شہر میں ۵۶ سال کی عمر میں دار فانی سے کوچ کیا (الامام محمد عبدہ رائد الاجتھاد فی العصر الحدیث، ص/ ۲۸)

والدین:

والد کا نام ''عبدہ'' تھا اور سواحل نیل کی جغرافیائی جائے وقوع کے پیش نظر کھیتی باڑی کرتے تھے۔

محمد اپنے والد کے بارے میں کہتے ہیں: ''میری نگاہ میں میرے والد دیہات کی سب سے بزرگ شخصیت تھے حتی دنیا کے سب سے بڑے انسان، چونکہ میری نظروں میں دنیا یہی میرا دیہات تھی۔

علاقہ کے بعض حکام جب اس دیہات میں آتے تھے تو دیہات میں بہت سے ثروت مند لوگوں کی سکونت کے باوجود میرے والد کے گھر میں ہی قیام کرتے تھے۔

اسی بنا پر یہ بات میرے وجود میں راسخ ہوگئی کہ مرتبہ میں بڑے ہونے کا دولت مند ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

میری والدہ کی منزلت بھی دیہات کی خواتین کے درمیان والد صاحب کی مردوں کے درمیان منزلت سے کم نہ تھی۔ میری والدہ فقیروں کی مدد کرتی تھیں ان سے محبت کرتی تھیں اور ہمیشہ خدا کا شکر ادا کرتی تھیں'۔(الامام محمد عبدہ بین المنہج الدینی والمنہج الاجتماعی، ص/۲۷)

کہا جاتا ہے کہ محمد عبدہ کے والد نوجوانی کے دور میں حکام کی سختیوں اور انکے ظلم وستم کی وجہ سے اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے، اور دوران سفر محمد عبدہ کی والدہ سے ''حنیہ'' نامی دیہات میں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ اور کچھ عرصہ بعد اپنے وطن ''محلّہ نصر'' پلٹ آئے اور اپنے لوٹے ہوئے مال وزر کو واپس لے لیا۔ اسی وجہ سے جب محمد پیدا ہوئے تو ان کے والد کی مالی حالت اچھی تھی اور وہ ان کی تعلیم وتربیت کے ضروریات کو پورا کر لے گئے جبکہ محمد کے بھائیوں کے لئے تعلیم کا انتظام نہ ہوسکا اور وہ کھیتی باڑی میں لگ گئے۔

ابتدائی تعلیم اور وطن واپسی

محمد نے دو سال کی عمر میں لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ پھر مکتب گئے اور ایک حافظ قرآن کے زیر نگرانی قرآن پڑھنا سیکھا اور دو سال بعد قرآن کو حفظ کیا۔ ان کے والد نے حفظ قرآن سے خوش ہو کر انھیں قرأت وتجوید قرآن اور دیگر علوم کی تحصیل کے لئے (مصر کے مغربی صوبے) ''طنطا'' میں بھیج دیا تا کہ 'مسجد احمدی' میں وہ اپنے دروس کو جاری رکھ سکیں۔ اس وقت شہر طنطا میں مسجد احمدی حفظ، تجوید اور تفسیر کے علاوہ دیگر قرآنی علوم کی تعلیم کا مرکز تھی۔ اس مسجد کے دینی اور اجتماعی پروگرام روزانہ نماز مغربین کے درمیان انجام پاتے تھے اور ہر ہفتہ نماز جمعہ کے بعد تجوید اور حفظ قرآن کی کلاسیں لگتی تھیں اور اس کلاس کے طلباء ہی بعد میں اس کلاس کے اساتید بنتے تھے۔ (عثمان امین، شیخ محمد عبدہ، مصلح بزرگ مصر، ص/۱۰/۱۲) محمد عبدہ کے ماموں شیخ مجاہد مسجد احمدی میں تجوید کے استاد تھے۔ (عبدالحلیم

جندی، الامام محمد عبدہ، ص/۷)

محمد نے پندرہ سال کی عمر میں قرآن وتجوید کی مکمل تعلیم کے بعد اسی مسجد میں ادبیات عرب کی تحصیل شروع کردی اور ''شرح کفراوی براجرومیہ'' نامی کتاب پڑھنے لگے۔ لیکن چونکہ ادبیات عرب میں لکھی گئی تعلیمی کتابیں خصوصاً مذکورہ کتاب پیچیدہ اور سخت تھی اور اس کتاب میں جوان طلباء کے ذہنی شعور کو مدنظر نہیں رکھا گیا تھا اس وجہ سے محمد تعلیم کو آگے بڑھانے کے سلسلہ میں مایوسی کا شکار ہوگئے اور وطن واپسی کا ارادہ کرلیا۔ (عثمان امین، وہی مدرک، ص/۱۲/۱۴)۔ اس صورت حال کے بعد تین ماہ تک اپنے ماموں کے گھر میں چھپے رہے یہاں تک کہ محمد کے بھائی نے ان کے ارادہ کو بھانپ لیا لیکن مسجد احمدی میں واپس جانے کے لئے ان کی کوششیں کامیاب نہ ہوسکیں۔ آخر کار محمد اپنے بستر بوریے کے ساتھ وطن واپس آگئے۔ اور وہاں کچھ مدت تک اپنے گھر والوں کے ذہن کو اس واقعہ سے دور رکھنے کے لئے شادی کا پروگرام بنایا اور ۱۲۸۲ھ میں اپنے ہی دیہات کی ایک دوشیزہ سے شادی کرلی۔ (عبدالحلیم جندی، الامام محمد عبدہ، ص/۷و۸؛ عثمان امین، وہی مدرک، ص/۱۴/۱۸)

تعلیم کی طرف بازگشت اور طنطا کا سفر

محمد کے مستقبل کے لئے اپنی پوری محنت لگا دینے والے محمد کے والد اس بات سے بہت پریشان اور فکرمند تھے کہ وہ درس کو چھوڑ کر کھیتی باڑی میں لگنا چاہتے ہیں۔ وہ انھیں کسی بھی صورت علمی ماحول میں واپس لانے کے لئے کوشاں تھے۔ جب محمد کی شادی کو چالیس روز ہوگئے تو ان کے والد ان کے پاس آئے اور انھیں طنطا جانے اور علمی سرگرمی کو جاری رکھنے پر تیار کرنے لگے۔ انھیں والد کی اطاعت کے علاوہ کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا لہٰذا رخت سفر باندھ کر والد کے ایک مورد اعتماد شخص کے ساتھ طنطا چلے گئے۔ شدت کی گرمی اور تیز لُو کی آندھیوں کے سبب مزید سفر کے لئے محمد کی طاقت نے جواب دے دیا اس وجہ سے محمد اپنے ہمسفر کے ساتھ ''کنیسہ اورین'' نامی دیہات میں چلے گئے جہاں محمد کے ماموؤں کی بودوباش تھی۔ اور اس دن شام کو محمد نے اپنے ہمسفر کو یہ یقین دلایا کہ وہ ضرور

طنطا جائے گا اور یہ کہ اب وہ ان سے جدا ہو سکتے ہیں۔

کنیسہ اورین میں محمد کی ملاقات بلند مرتبہ بوڑھے شخص سے ہوئی جو شیخ درویش کے نام سے مشہور تھا وہ اس سے مانوس ہو گئے ایک دن درویش نے اپنے استاد کی ایک کتاب لی اور محمد کے پاس آ کر اس سے کہا کہ میری آنکھیں ذرا کمزور ہیں اگر ہو سکے تو میرے لئے تھوڑی سی کتاب پڑھ دو! محمد کو تو کتاب اور کتابیات سے نفرت ہو چکی تھی لہٰذا انھوں نے بڑی سختی کے ساتھ اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور کتاب کو دور پھینک مارا۔ متحمل مزاج بوڑھے نے ایک بار پھر اپنی خواہش کو دہرایا یہاں تک کہ آخر کار محمد تھوڑی سی کتاب پڑھنے پر راضی ہو گئے جب اس کتاب کی چند سطریں پڑھیں تو شیخ درویش نے اس کے معانی بیان کرنا شروع کر دئے۔ یہ طریقہ تین دن تک جاری رہا اور پھر تیسرے دن محمد نے تقریباً تین گھنٹہ تک شیخ کی کتاب کو پڑھا اور شیخ نے توضیح دی اس کے باوجود خستگی کا احساس نہ کیا، بلکہ جب بوڑھے نے کھیتی کے کام کے لئے گھر سے نکلنا چاہا تو محمد نے امانتاً وہ کتاب لے لی اور اس کا مطالعہ شروع کر دیا اور جہاں جہاں سمجھ میں نہ آیا وہاں وہاں نشان لگاتے رہے تاکہ شیخ سے پوچھ لیں۔ اس طرح ایک بار پھر کتاب پڑھنے کا شوق محمد کے اندر جاگ اٹھا اور خود ان کے بقول پانچویں دن ان کے اندر ایک انقلاب سا آ گیا اور پھر مطالعہ و کتاب خوانی سے زیادہ ان کے نزدیک کوئی اور شے محبوب نہ تھی۔ (عثمان امین، وہی مدرک، ص/۲۱/۲۳)۔

درحقیقت کہا جا سکتا ہے کہ شیخ درویش نے محمد کو ذہنی الجھن اور تعلیم سے بیزاری کے دلدل سے نکالا ہے کیونکہ درویش سے آشنائی کے بعد ہی محمد نے مسجد احمدی جانے کا اردہ کیا اور اپنی تعلیم کو آگے بڑھایا۔ (وہی مدرک، ص/۲۷)۔

جمادی الثانی ۱۲۸۲ھ کو محمد سولہ سال کی عمر میں طنطا پلٹ آئے اور مسجد احمدی میں نئے جذبہ اور یکسوئی کے ساتھ تعلیم میں مشغول ہو گئے۔ البتہ اس بار 'شرح شیخ خالد براجرومیہ' نامی ایک آسان کتاب کی تدریس ہو رہی تھی۔

محمد نے وہاں چار ماہ کی تحصیل کے بعد مشہور یونیورسٹی ''الازہر'' جانے کا پروگرام بنایا، لہٰذا پندرہ شوال ۱۲۸۲ھ میں قاہرہ کے لئے رخت سفر باندھ لیا۔ (عبدالحلیم جندی، الامام محمد عبدہ، ص/۱۱)۔

محمد عبدہ ''الازہر'' یونیورسٹی میں

اس یونیورسٹی کی قدمت وتاریخ ۳۵۰ھ۔۳۶۰ھ تک جاتی ہے۔ اور چوتھے فاطمی خلیفہ (المعزّ لدین اللہ، حکومت ۳۴۱۔۳۶۵) کے ذریعہ فتح مصر اور شہر 'قاہرہ'' کی تاسیس کے وقت اس کے حکم سے اس شہر کی پہلی مسجد بنائی گئی۔ اور چونکہ فاطمی خلفاء شیعہ تھے اس لئے حضرت زہراؑ کے نام سے منسوب کر کے اس مسجد کا نام ''الازہر'' رکھا۔ فاطمیین کی دور کے اختتام تک یہ مسجد، اسماعیلی شیعوں کے مذہبی علوم کا مرکز رہی۔ گزشتہ سو سالوں سے اب تک الازہر یونیورسٹی ایک اہم تعلیمی مرکز سمجھی جاتی ہے اور ۱۳۲۹ھ میں مصر کے سب سے بڑے علمی مرکز کے طور پر مانی گئی اور طنطا، دسوق، دمیاط اور اسکندریہ کے مدارس اس کے تحت آ گئے۔ (علی جواہر کلام، تاریخ مصر و خاندان محمد علی بزرگ، ص/۱۹۷؛ دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، ج/۸، ص/۶۳)۔

محمد نے الازہر یونیورسٹی میں علم تفسیر، فقہ، اصول، ادبیات وتاریخ اسلام کی تحصیل کی اور چونکہ علوم عقلی اس یونیورسٹی میں پڑھائے نہیں جاتے تھے لہٰذا منطق وفلسفہ کے لئے 'شیخ حسن الطّویل' کے پاس گئے اور ابن سینا کے فلسفہ اور ارسطو کی منطق کا کچھ حصہ یہاں پڑھا۔ (الامام محمد عبدہ بین المنہج الدینی والمنہج الاجتماعی، ص/۳۷)۔ پھر ۱۲۸۷ھ میں جب 'سید جمال الدین اسدآبادی' قاہرہ پہنچے تو محمد ان کے پاس گئے اور ان کے درس میں شرکت کی۔

سید جمال قاہرہ میں الازہر کے اندر اور باہر علوم عقلی کی تدریس میں مشغول ہو گئے اور محمد عبدہ پہلے شاگرد تھے جو ان سے منسلک ہوئے۔ عملی طور پر محمد عبدہ کے اوپر سب سے زیادہ اثر چھوڑنے والی شخصیت انھیں استاد والا مقام کی ذات تھی جو کہ سالوں تک ایک ساتھ رہے اور شیخ محمد عبدہ استاد جمال الدین کے قریب ترین شاگردوں میں تھے۔ محمد کو اس استاد سے بڑا لگاؤ تھا اور اپنے آپ کو ان کے سامنے بہت کم سمجھتے تھے۔ بیروت سے پارلیس لکھے جانے

والے خط کے شروع میں محمد ان کو ''مولائے اعظم' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ محمد خود بھی سید کے دروس میں شرکت کرتے تھے اس کے علاوہ دوسروں کو بھی ترغیب دلاتے تھے کہ وہ استاد کی ریاضیات اور فلسفہ وکلام کی کلاسوں میں شرکت کریں۔ (شیخ محمد عبدہ مصلح بزرگ مصر، ص/۴۰)۔ الازہر کے اساتید اور بہت سے طلباء نے سید کے شاگردوں اور خود محمد عبدہ پر تہمت بازیاں شروع کردی تھیں ان کا خیال تھا کہ یہ علوم عقائد کی کمزوری کا سبب ہوں گے۔ (تاریخ مصر و خاندان محمد بزرگ، ص/۱۸۷)۔

بہرحال اس یونیورسٹی میں آنے کے بعد سے محمد نے اپنے زیادہ تر علوم کو حاصل کیا یہاں تک کہ حد کمال تک پہنچ گئے۔ پھر وہ خود شاگردوں کی تربیت میں لگ گئے۔ ان کے اہم شاگردوں میں 'محمد رشید رضا' کا شمار ہوتا ہے جو محمد عبدہ کے درس تفسیر میں شرکت کرتے تھے اور ان دروس کو 'تفسیر المنار'' نامی کتاب میں اکٹھا کیا ہے۔ محمد عبدہ کے دوسرے شاگردوں میں ''سعد زغلول/متوفائے ۱۳۴۶ھ''؛ ''طہ حسین/متوفائے ۱۳۹۳ھ''، ''شیخ عبدالقادر مغربی''، ''شیخ مصطفی عبدالرزاق''، ''شیخ محمد مصطفی مراغی'' کو شمار کیا جاسکتا ہے اگرچہ ان کے بعض شاگرد مثلاً محمد رشید رضا تشیع سے ناہم آہنگ تھے۔ (نہضت ہائے اسلامی در صد سالہ اخیر، ص/۴۵)۔ محمد مصطفی مراغی جیسے دوسرے بعض شاگرد محمد عبدہ کے مکتب فکری سے بہت ہی قریب شمار ہوتے ہیں جو استاد سے کافی اثر پذیر رہے۔ (الامام محمد عبدہ و منہجہ فی التفسیر، ص/۳۳۲/۳۳۷)۔

اصلاحی جدّ وجہد

شیخ محمد عبدہ کی جد وجہد (جو کہ غالبا سید جمال الدین کے ساتھ تھیں) کو بیان کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ اس وقت کی سیاسی اور سماجی صورتحال پر ایک نظر کرلی جائے۔ اس وقت مصری سماج میں بادشاہ کو ''خدیو'' کہا جاتا تھا۔ شیخ محمد عبدہ کے زمانے میں کئی خدیو حکومت کرتے تھے اس میں کا پہلا 'اسماعیل پاشا' تھا جس کے زمانے میں محمد عبدہ کی کچھ جد جہد انجام پائیں۔ وہ ابرہیم پاشا کا بیٹا اور محمد علی پاشا کا پوتا تھا۔ اسماعیل پاشا کافی عرصہ تک پیرس

میں تھا اور وہاں تعلیم میں مشغول رہا۔ اپنی حکومت میں اس کی کوشش رہی کہ مصری آداب و رسوم کو مغربی کلچر میں ڈھال دے۔ اس نے سولہہ سال حکومت کی اور سلطنت کو اپنے خاندان میں میراثی بنادیا۔ وہ اگرچہ مغربی کلچر سے متاثر تھا لیکن آخرکار عوام کے دباؤ اور دیگر وجوہات کے تحت مغربیوں کے مقابلہ میں آیا اور برطانیہ کے معاشی مطالبات کو قبول نہیں کیا۔ اسی تسلسل میں خدیو اسماعیل کے حکم اور سید جمال کے دباؤ کی وجہ سے ۷۵/افراد پر مشتمل مصر کی مشاورتی مجلس وجود میں آئی۔ (تاریخ مصر و خاندان محمد علی بزرگ، ص/۹۶)۔

اسماعیل پاشا کے بعد اس کا بیٹا توفیق پاشا، مسند حکومت پر بیٹھا اس نے اپنے باپ سے بھی بدتر کام انجام دئے۔ اس نے پہلے سید جمال الدین کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا لیکن کچھ دنوں بعد ہی ان کے خلاف موقف اپنالیا۔ سید جمال الدین کا خیال تھا کہ سماجی مصلحین کو مل کر بیٹھنا چاہئے اور ایک ادارہ اور تنظیم کی شکل میں جد و جہد کرنا چاہئے تاکہ اس وقت مصر میں اثر رسوخ پیدا کرنے والی استعماری طاقتوں سے مقابلہ کیا جاسکے۔ سید جمال نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے 'حزب وطنی' نامی ایک سیاسی پارٹی قائم کی اور اپنے خاص اور مثبت فکر والے شاگردوں میں سے تین سو کے قریب طلباء کو جمع کیا۔ سید جمال کے بعد سب سے اہم شخصیت کے طور پر محمد عبدہ اس پارٹی میں کام کرتے تھے۔ (عبدالحلیم جندی، الامام محمد عبدہ، ص/۲۴؛ عثمان امین، وہی مدرک ص/۴۷)۔

''حزب وطنی'' مصر کے اہداف

اس پارٹی کا اصلی ہدف یہ تھا کہ بیگانوں کے اثر و رسوخ کو روکے اور مصر کو ان نااہل افراد سے پاک کرے جو حکومتی ڈھانچہ میں دراندازی کر چکے تھے نیز ملک کو ایک فرد کے تسلط سے نکال کر قانون کا پابند کرے۔ (گزشتہ حوالے کی ترتیب کے ساتھ: وہی مدرک، ص/۲۴؛ وہی مدرک، ص/۴۷)۔ شیخ محمد عبدہ نے اس پارٹی کی دوسری شخصیت کے عنوان سے بہت سے تحریری اور تقریری کام انجام دئے ہیں۔ انھوں نے سماج میں اس حزب کے مفید پروگراموں کیلئے منعقد ہونے والی نشستوں میں ۱۷/اہم مادوں کو تصویب کرایا جو مصر میں ایک انقلاب کا سبب

بنے۔حزب کی ایک ماہ کی کارکردگی ہی سے برطانیہ کے مالی مشیر 'لرڈ کرومر' نے اندازہ لگالیا کہ ایک ہی دفعہ میں مصر کے اندر برطانیہ کا ۴۵۔اثر کم ہوگیا ہے اور برطانیہ کی تجارت میں ۳۵۔کمی آئی ہے۔کرومر کو دی گئی رپورٹ کے مطابق مصر میں عیسائیوں کی ۳۵ سالہ تبلیغ کے مقابلہ میں حزب وطنی کی ایک ماہ کی کارکرگی میں وہی نسبت ہے جو ایک کی سولہ سے ہوتی ہے۔گھبرائے ہوئے کرومر نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا ہے کہ:''اس طرح میں برطانیہ کے سربراہوں کے لئے خطرے کا اعلان کرتا ہوں کہ اگر سید جمال الدین کی سربراہی میں حزب وطنی کی جد جہد ایک سال تک اور جاری رہی تو نہ صرف یہ کہ ایشیا اور افریقا میں برطانیہ کی سیاست اور تجارت نابود ہوجائے گی بلکہ اس بات کا خدشہ ہے یک بیک پوری دنیا یورپ کے ہاتھ سے نکل جائے''۔(سید عبدالکریم ہاشمی نژاد، مناظرہ دکتر و پیر، ص/۴۰۴۔۴۱۰)۔

یہ اعترافات بتاتے ہیں کہ شیخ محمد عبدہ نے اس بات کی صحیح تشخیص دے لی تھی کہ سچے اسلام کی طرف پلٹ جانا چاہئے۔مصر کیخدیو توفیق پاشا نے جسے اس حزب کی فعالیتوں سے خدشات پیدا ہوگئے تھے،سید جمال الدین سے بات چیت کی کہ شاید انھیں اس کام سے روک سکے لیکن سید جمال اور خدیو کے درمیان ہونے والی گفتگو میں سید نے اس کی باتوں کو اہمیت نہیں دی۔اور آخر کار برطانیہ کے سفیر کے دباؤ میں آکر سید جمال الدین پر مصر سے جلاوطنی کا حکم لگایا دیا گیا۔(عبدالحلیم جندی، الامام محمد عبدہ، ص/۳۶)۔اس کے بعد شیخ محمد عبدہ مدرسہ دارالعلوم اور مدرسۃ الالسن کے استادی سے برخاست کردئے گئے؛ اور ۱۲۹۶ھ میں رمضان کے درمیان حکم ملا کہ وہ اپنے دیہات میں واپس جائیں۔(شیخ محمد عبدہ مصلح بزرگ مصر، ص/۵۱۔۵۲)۔جب سید جمال الدین مصر سے باہر جارہے تھے تو یہ جملہ ارشاد فرمایا:''انی ترکت الشیخ محمد عبدہ و کفاہ لمصر عالما''[میں نے شیخ محمد عبدہ کو چھوڑا ہے اور مصر کے لئے ان جیسا عالم کافی ہے]۔(محمد رشید رضا، تاریخ الاستاذ الامام، ج/۳، ص/۲)

میڈیا کے ذریعہ جد جہد

شیخ محمد عبدہ اگرچہ اپنے دیہات جلاوطن ہوئے تھے لیکن وہ اپنی بستی نہیں گئے بلکہ قاہرہ کے اطراف میں چھپ گئے تا کہ مناسب وقت میں اپنی علمی سرگرمیوں کو پھر سے شروع کریں۔ مصر کے وزیراعظم ریاض پاشا کی ادبیات اورادبی سرگرمیوں سے اس قدر دلچسپی تھی کہ ان کی حمایت سے ''دائرۃ المعارف بستانی'' لکھی گئی اوراسی بات نے محمد کوان سے رابطہ قائم کرنے پر مجبور کردیا تا کہ ان کے ذریعہ خدیو کی طرف سے معاف کردئے جائیں۔ ریاض پاشا کے مطالبہ کو مصر کے خدیو کی طرف سے قبول ہونے کے سبب محمد کوایک بار پھر دینی وادبی فعالیت کا موقع مل گیا اور ۱۲۹۷ھ میں انھوں نے 'الوقائع المصریہ' نامی اخبار کی ایڈیٹنگ کو قبول کرلیا۔ محمد نے سعد زغلول، ابراہیم ہلباوی جیسے اور کئی دوستوں کو اپنے پاس جمع کرلیا اور اخبار لکھنے میں مشغول ہوگئے۔ اس اخبار کی مدیریت اٹھارہ ماہ تک چلی اور انھوں نے اسی مختصر سی مدت میں متعدد دینی، ادبی اور اجتماعی مقالات پیش کئے۔ (الاعمال الکاملۃ لامام الشیخ محمد عبدہ، ج۲،ص۳۳-۳۷)۔

وہ ان مقالات کے ساتھ حکومت کی پالیسیوں پر بھی نکتہ چینی کرتے تھے اور مجلس کی مضبوطی کے ذریعہ ملک کے حالات کو سدھارنے کی اپنی تجویز کو پیش کرتے تھے۔ وہ ہر اس فرد، ادارے اور وزارت پر تنقید کرتے تھے جو الٰہی راہ پر گامزن نہیں تھا۔ ملکی سطح پر فیصلہ کرنے والی مجلس اعلی کے سلسلہ میں محمد عبدہ کے متعدد مقالات باعث ہوئے کہ 'مجلس اعلائے مصر' تشکیل پائے اور وہ خود اس کی عضو ہوجائیں۔ (عثمان امین، وہی مدرک، ص۵۴-۵۵)۔ قومی مجلس کی تشکیل اور اس سلسلہ میں مختلف کشمکش کے بعد اس مجلس کے بارے میں برطانیہ اور فرانس اور کچھ مصری رہبروں کی مخالفت نے قومی مجلس کے حامی اور مصر کے ایک اعلی فوجی کمانڈر ''عراب پاشا'' کے انقلاب کے لئے زمین ہموار کردی۔ اور محمد عبدہ نے بھی اس انقلاب میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے اگرچہ وہ خود اس انقلاب کے حامی نہیں تھے اور بارہا مسلح مزاحمت کے بارے میں اپنی مخالفت کا اظہار کرچکے تھے۔ محمد کا خیال تھا کہ اصلاحات انجام دینے کے لئے ایسے کاموں کی ضرورت نہیں تھی بلکہ سماج کی تربیت اور اجتماعی شعور کو عروج دینے کے ذریعہ

مطلوبہ نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ وہ اپنی تقریروں میں کہتے تھے: ''عرابی پاشا کا فوجی انقلاب صحیح نہیں ہے۔ اس نے اپنے طریقہ کار کے ذریعہ مصر کو غیروں کے دامن میں ڈال دیا ہے اور اس ملک میں اجنبیوں کے اثر ورسوخ کو بڑھا دیا ہے''۔ (عبقری، الاصلاح والتعلیم، ص ۱۷۱)۔ لیکن ان تمام مخالفتوں کے باوجود جب مصر کو خطرہ میں دیکھا تو عرابی پاشا کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا اور اس کی حمایت کی۔ (عثمان امین، وہی مدرک، ص ۵۹)۔ چونکہ جدید حالات کے پیش نظر اور برطانیہ کے قبضہ کو روکنے کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ جب عرابی پاشا نے شکست کھائی اور جلاوطن ہوگیا تو شیخ محمد عبدہ بھی اس کے تعاون کے لئے تین ماہ جیل گئے اور پھر مصر سے جلاوطن کردئے گئے۔ انھوں نے قیدخانہ میں عرابی پاشا کے قیام کی حقیقت اور اس کے واقعات کو تحریر کیا اور اس سلسلہ میں اپنی نظر بیان کی۔ انھوں نے اس مکتوب میں واضح طور سے لکھا ہے کہ عرابی پاشا کے قیام میں برطانیہ کے مقابل ڈٹے رہنا چاہئے تھا لیکن افسوس کہ بعض لوگوں منجملہ سلطان پاشا نے خیانت کی۔ (الاعمال الکاملۃ للامام الشیخ محمد عبدہ، ج ۱، ص ۵۰۱۔۵۰۳)۔

پیرس میں ''عروۃ الوثقیٰ'' میگزین کا اجرا

جلاوطنی کے بعد ۳۳ سالہ محمد نے بیروت کی طرف سفر کیا اور وہاں سکونت اختیار کی۔ پیرس سے سید جمال الدین نے ان کے پاس خط لکھا کہ وہ ان کے پاس آجائیں تاکہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر پھر سے سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کریں۔ جب شیخ محمد عبدہ پیرس پہنچے تو سید جمال کے ساتھ 'عروۃ الوثقیٰ'' نامی میگزین شروع کی جس کی وجہ سے استعمار کے دلوں میں خوف پیدا ہوا اور امت اسلامی کی بیداری کا سبب بنا۔ اس مجلّہ کے مقالات میں ایک طرف اپنے حملوں کا رخ برطانیہ کے بوڑھے استعمار کی طرف کر رکھا تھا اور دوسری طرف مسلمانوں اور آسمانی ادیان کو اتحاد کی دعوت تھی۔ ''مسیحیت، اسلام اور ان دونوں کے پیروکار''، ''وحدت اسلامی''، ''ایرانی عوام کی افغانیوں کے ساتھ اتحاد کی دعوت'' جیسے عناوین اس فہرست میں شمار ہوتے ہیں۔ (شیخ محمد عبدہ مصلح بزرگ مصر، ص

۶۲)۔قارئین کی طرف سے اس میگزین کے زبردست استقبال کی وجہ سے جلد ہی اس کے شعبہ ہندوستان، مصر اور ٹیونس کے علاوہ دیگر ملکوں میں کھل گئے۔ اور ان ملکوں میں خفیہ طور پر تقسیم ہونے لگے۔ ان شعبوں کو کھولنے کے لئے شیخ محمد عبدہ نے ان ممالک کے سفر کئے اور متعلقہ رابطے قائم کئے۔

برطانیہ کے سیاستمدار اس میگزین کی تعداد کے روز بروز بڑھنے سے بڑے پریشان ہوگئے تھے اور اس کے قارئین پر جرمانہ عائد کرنے لگے تھے۔ انھوں نے میگزین کے مندرجات میں ردوبدل کرنے کے لئے سید جمال کو لندن آنے کی دعوت دی تاکہ ان کے ساتھ گفتگو کریں۔ سید جمال چونکہ شیخ محمد عبدہ پر اعتماد رکھتے تھے اور ان کی شجاعت کو بھی آزما چکے تھے لہٰذا ان کو اپنی طرف سے لندن بھیج دیا۔ اس سفر میں محمد عبدہ مصریوں اور سوڈانیوں کے پیغامات بھی لیکر گئے تھے تاکہ ہوسکتا ہے برطانیہ ان ممالک کے سلسلہ میں اپنے سلوک پر نظر ثانی کرے۔ آخر کار انگریز سید جمال اور محمد عبدہ سے مایوس ہوگئے اور ان کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ انھیں اپنے نفع میں استعمال نہیں کر سکتے۔ دوسری طرف محمد عبدہ نے بھی جان لیا کہ وہ لوگ اسلامی ممالک کے سلسلہ میں اپنے سلوک کو تبدیل نہیں کریں گے۔ لہٰذا پیرس واپس آگئے اور سید جمال کے ساتھ اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھا لیکن اٹھارہ ماہ بعد ہی چھپائی پر پابندی کے علاوہ دیگر مشکلات کے سبب ۱۳۰۲ھ میں میگزین بند ہوگئی۔ (عثمان امین، وہی مدرک، ص/۶۵۔۷۰)۔

محمد عبدہ کی بیروت واپسی

عروۃ الوثقیٰ میگزین کے بند ہونے کے بعد اپنی مہم کو آگے بڑھانے کے لئے جمال الدین نے ایران کا انتخاب کیا۔ شیخ محمد عبدہ بھی اپنے استاد سے جدا ہوگئے اور بیروت چلے گئے، کیونکہ مصر نہیں جا سکتے تھے۔ ان دو مردان الٰہی کی یہ آخری ملاقات تھی۔ شیخ محمد عبدہ بیروت میں قوم کی بیداری کے لئے کتب و مقالات لکھ کر اصلاحی کام انجام دیتے تھے اور ان کے مقالات ''ثمرات الفنون'' نامی میگزین میں چھپتے تھے۔ (وہی مدرک، ص/۷۶)۔ وہ بیروت میں عظیم کتاب 'نہج البلاغۃ' سے آشنا ہوئے اور اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ اس کی ادبی شرح لکھنے کا ارادہ کرلیا۔

نہج البلاغہ سے اپنی آشنائی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: ''قسمت سے اور اتفاقی طور پر میں نہج البلاغہ سے آشنا ہوا اور یہ اتفاق اس وقت رونما ہوا جب میں الجھاؤ، افسردگی، اور اپنے کاموں میں عدم دلچسپی کا شکار تھا۔ جب بھی کسی حصہ کے مطالعہ کو چھوڑ کر کتاب کے دوسرے حصہ کو شروع کرتا تھا تو ایک نئی بات اور تازہ نکتہ کا احساس ہوتا تھا''۔

شیخ محمد عبدہ کا عقیدہ تھا کہ عربی زبان ہر دن بدلتی رہتی ہے اور جوان لڑکے عرب کی قدیم اور بلیغ نثر کو سمجھتے نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے نہج البلاغہ کی شرح میں انھوں نے اس کتاب کی بلاغت کو زیادہ مرکز توجہ قرار دیا ہے اور ایسے مسائل کو چھیڑنے سے پرہیز کیا ہے جو شیعہ اور سنی کے درمیان اختلاف کا باعث بنتے ہیں۔ وہ شرح نہج البلاغہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: ''اس زبان میں گفتگو کرنے والا کوئی نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اعتراف کرتا ہو کہ کلام الٰہی اور اقوال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کے بعد امام علی ابن ابیطالب علیہ السلام کا کلام سب سے زیادہ بلیغ ہے۔ گفتگو میں گہرائی سب سے زیادہ، زبان کے اسلوب سب سے بالاتر اور بلند مفاہیم کو ادا کرنے میں ان کا کلام سب سے جامع ہے'' (شہید مرتضیٰ مطہری، سیری در نہج البلاغہ، ص/۱۷)۔

بیروت میں مدارس کے نظام کی اصلاح

شیخ محمد عبدہ چونکہ سید جمال کے شاگرد تھے لہٰذا انھیں کی طرح ان کی جد جہد اور اصلاحات کا جذبہ اپنے جغرافیائی حدود سے وسیع تر تھا۔ وہ تمام دنیائے اسلام کے لئے سوچتے تھے۔ جب وہ بیروت میں تھے تو عثمانی بادشاہ عبدالحمید کی طرف سے ایک حکم صادر ہوا جس کے تحت شیخ الاسلام عثمانی کی صدارت میں ایک کمیٹی اسلامی مدارس کے نظام کی اصلاح کے لئے مامور تھی۔ محمد نے (یعنی جس کی روح ودل کو آرام کی فرصت ہی نہیں تھی) اس سلسلہ میں ایک لائحہ عمل تیار کیا اور تکمیل کے بعد شیخ الاسلام عثمانی کے پاس بھیج دیا اور اپنے اس کام کے ذریعہ اسلامی مدارس کی اصلاح میں شریک ہوگئے۔ انھوں نے اس لائحہ عمل میں ہر تعلیمی مرحلہ کے لئے حتیٰ معلمین کے لئے کچھ تجویزیں پیش

کیں۔(الاعمال الکاملۃ لا مام الشیخ محمد عبدہ، ج/۱، ص/۷۵)۔

بیروت میں ''جمعیت مقاصد خیریہ'' کا قیام

شیخ محمد نے بیروت میں احساس کیا کہ فرانس اور برطانیہ نے لبنان کے مراکز اقتدار میں گھس کر سماج کی جوان نسل کے فکری انحرافات کیلئے وسیع پیمانے پر ثقافتی یلغار کر رکھی ہے۔اسی وجہ سے ایک فلاحی تنظیم قائم کی جس میں مسلم جوانوں کی تربیت اور ان کے دلوں میں دینی عقائد کو زندہ کرنے کے لئے نیز ان کے افکار واذہان کو غیروں کے اثر ورسوخ سے بچانے کی کوشش ہوتی تھی۔بعض وابستہ عیسائی جو اس تنظیم کے کاموں کا جاری رہنا اپنے لئے نقصان دہ سمجھتے تھے انھوں نے اس کے خلاف یہ پھیلایا کہ یہ تنظیم تعلیمی نہیں ہے بلکہ سیاسی ہے اور اس طرح یہ لوگ اس بات کا باعث بنے کہ یہ تنظیم ایک معمولی مجلس کی حد تک آجائے اور پھر آہستہ آہستہ ختم ہو جائے۔(وہی مدرک، ج/۳، ص/۱۰۲)۔

مصر واپسی اور دینی وثقافتی سرگرمیوں کی توسیع

۱۳۰۶ھ میں مصر کے سیاسی حالات میں کچھ تبدیلی آئی اور ریاض پاشا دوبارہ اقتدار میں آگیا اور وزیر اعظم بنا دیا گیا۔اس سے ایک طرف تو محمد عبدہ کے مصر واپسی کے لئے حالات ہموار ہوئے۔اور دوسری طرف شیخ محمد عبدہ کا نام زبانزد خاص وعام ہو چکا تھا اور ان کا سیاسی مقام اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ اب اس سے زیادہ جلاوطنی میں رہیں۔اس لئے شیخ محمد کے بعض شاگردوں اور دوستوں مثلاً سعد زغلول اور غازی مختار نے مختلف افراد کے ذریعہ اس بات کی کوشش کی کہ خدیو سے شیخ کے وطن واپس آنے کی اجازت لے لیں۔توفیق پاشا چونکہ شیخ سے حد درجہ ناراض تھا اس لئے صرف اس شرط پر مصر واپسی کی اجازت دی کہ شیخ سیاسی معاملات میں مداخلت نہ کریں۔(عبدالحلیم جندی، الامام محمد عبدہ، ص۴۹)۔شیخ محمد بھی چونکہ خالص سیاسی روشوں سے مایوس ہو چکے تھے لہٰذا اس شرط کو قبول کر کے مصر واپس آگئے اور قوم کی آگاہی کی سطح بلند کرنے کے ذریعہ سماج کی اصلاح کے لئے کمر ہمت

باندھی۔

انھوں نے مصر میں وارد ہونے کے بعد تقاضا کیا کہ انھیں ایک بار پھر مدرسہ دارالعلوم میں تدریس کا موقع دیا جائے، لیکن توفیق پاشا نے اسے نہ مانا البتہ یہ تجویز پیش کی کہ شیخ محمد مصر کی کسی عدالت میں قاضی کے عنوان سے مشغول ہوجائیں۔ وہ دوسال تک قضاوت کی فعالیت کے بعد اپیل کی عدالت میں مشیر کے عنوان سے معین ہوگئے۔ عدالتوں کے ذمہ داران فرانس کے عدالتی قوانین سے واقف تھے لہٰذا فرانس کے عدالتی قوانین وقواعد کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے شیخ محمد نے فرنچ سیکھنے کا ارادہ کیا۔ فرنچ زبان اور فرانس کے عدالتی احکام کو سیکھنے سے شیخ کا مقصد یہ نہیں تھا کہ اس کے اصول کے مطابق عمل کریں، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ فرانس کا عدالتی نظام جیسا بھی ہو وہ احکام اسلامی سے اچھا نہیں ہے؛ بلکہ زبان سیکھنے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اسلام اور اس کے احکام کی عظمت کو پہچنوا سکیں یہاں تک کہ مصر کے بعض قضات نے یہ اعتراض کیا تھا کہ شیخ فرانس کے عدالتی دستور کے مطابق عمل نہیں کرتے۔ (عثمان امین، وہی مدرک، ص/۸۶)۔

۱۳۹۰ھ میں توفیق پاشا کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا عباس پاشا مصر کا خدیو ہوا۔ عباس پاشا کی سیاسی روش اپنے باپ کے بالکل برخلاف تھی اور اس کے زمانے میں اس کے باپ کے بہت سے مخالفین اس کے اردگرد اکٹھا ہوگئے تھے۔ محمد نے بھی موقع کو غنیمت جانا اور عباس پاشا کے نزدیک ہوگئے۔ شیخ محمد نے خدیو کو تجویز پیش کی کہ وہ الازہر یونیورسٹی کے اساتید میں شامل ہوجائے اور اس طرح اس عظیم یونیورسٹی میں کچھ اصلاحات انجام دے اور اس بات پر زور دیا کہ یہ کام کسی طرح سے سیاسی نہیں ہے بلکہ ایک دینی اور ثقافتی کام ہے۔ مصر کے خدیو نے یہ تجویز قبول کرلی اور حکم دیا کہ الازہر کے پروگراموں کی نظم وترتیب کے لئے ایک شوریٰ تشکیل دی جائے۔ شیخ حسونہ اس شوریٰ کے سرپرست اور شیخ محمد عبدہ اس کے ایک عضو قرار پائے۔

محمد عبدہ نے اس فرصت میں، پہلے طلاب کے پروگراموں کو نظم دیا اور ان کی حفظان صحت کی حالت کو

کنٹرول کیا۔اس کے بعد درسی امور میں اصلاحات کا ارادہ کیا تو یونیورسٹی میں صدائے فریاد واعتراض بلند ہونے لگی۔انھوں نے سوچا تھا کہ طلباء کے لئے بہتر کتب کا انتخاب کریں اور اس سے امتحان لیں۔مصر کے شیوخ میں سے ایک نے محمد عبدہ کو خط لکھا اور اسے متوجہ کیا کہ عملی روش کے ساتھ حساب کو سیکھنے سے عقل تباہ ہوجاتی ہے اور لوگ دین سے بیزار ہوجاتے ہیں اور طلباء کا امتحان لینا تعلیمی راہ میں سب سے بڑی دیوار ہے۔(تاریخ الاستاذ الامام شیخ محمد عبدہ، ج ۳،ص ر۱۲۸)۔

۱۳۱۰ھ میں محمد عبدہ نے مصر کے مختلف مدارس کے طلباء اور اساتید کے افکار کی اصلاح کے لئے ''جمعیت خیریہ اسلامی'' نامی ایک مرکز قائم کرنے میں شرکت کی۔(الامام محمد عبدہ رائد الاجتہاد والتجدید فی العصر الحدیث،ص ر ۲۷؛ عثمان امین وہی مدرک،ص ر۹۲)۔اور ۱۳۱۳ھ میں الازہر یونیورسٹی کے سرپرست کے طور پر منتخب ہوئے اور ان سالوں میں کچھ اقدامات کئے مثلا بعض درسی متون کی اصلاح۔(دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، ج۸،ص ر۶۵علیہ السلام ۶۹)۔وہ ۲۴ر محرم الحرام ۱۳۱۷ھ میں مصر کے مفتی اعظم ہوئے۔اور اس مقام سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی اصلاحات کے میدان کو اور وسیع کرنے میں کامیاب رہے۔(عثمان امین، وہی مدرک،ص ر۲۱۸)۔اس کے بعد سے الازہر میں اپنے تفسیر کے دروس کا آغاز کیا اور اسی سال کی اٹھارہ صفر کو مجلس شورائے قوانین کے عضو ہوگئے۔ ۱۳۱۸ھ میں ''جمعیۃ احیاء العلوم العربیۃ'' نام کا ایک ادارہ قائم کیا جو اسلامی آثار کی تحقیق واشاعت کرتا تھا۔(الامام محمد عبدہ رائد الاجتہاد والتجدید فی العصر الحدیث،ص ر۲۷)۔

تقریب مذاہب میں محمد عبدہ کے تفکرات اور کردار

محمد عبدہ قوم کے انھیں دردوں کا احساس کرتے تھے جن کی سید جمال نے تشخیص دی تھی۔جو چیز ان میں سید جمال سے الگ تھی وہ یہ تھی کہ وہ مغربی تمدن کے مقابلے میں مسلمانوں کے مذہبی فکر کے بحران اور دنیا کے جدید تقاضوں کی طرف خاص توجہ دیتے تھے کہ ایک عرصہ کے جمود کی وجہ سے مسلمان اس بحران کا مقابلہ کرنے طاقت نہیں

رکھتے تھے۔سید جمال سے جدائی کے بعد جس چیز نے محمد عبدہ کو زیادہ فکر مند کیا تھا وہ ایک ایسے درمیانی راستے کی تلاش تھی جو بعض علماء کے فکری جمود اور ناپختہ نام نہاد روشنفکروں کی زیادہ روی کے درمیان کا راستہ ہو۔سید جمال کے برخلاف عبدہ کو ایسی ذمہ داری کا احساس تھا جو ایک عالم دین محسوس کرتا ہے۔اسی وجہ سے عبدہ نے ایسے مسائل کو چھیڑا جنھیں سید جمال نے ہاتھ نہیں لگایا تھا؛ مثلا چاروں مذہب کا 'فقہ مقارن'، اجتہاد میں فلسفہ قانون کے مبانی کو دخیل کرنا اور فقہ میں ایسا نیا نظام قانون تشکیل دینا جو دنیا کے زندہ مسائل کا جواب دے سکے۔سید جمال کی طرح دنیائے اسلام کی وحدت کے آرزومند اور فرقہ وارانہ تعصب کے مخالف محمد عبدہ نے جب اپنے بقول نہج البلاغہ کو 'کشف' کیا تو اس کی شرح لکھتے وقت ان خطبوں کی شرح لکھنے میں نہیں ہچکچائے جو صدر اسلام کے خلفاء کے خلاف تھے۔اور حضرت علی علیہ السلام کے بلیغ و بے مثال کلام کی تعریف کرنے سے پرہیز نہیں کیا۔(مرتضیٰ مطہری، نہضت ہائے اسلامی در صد سالہ اخیر، ص ۳۶)۔

شیخ محمد عبدہ مغرب کا مقابلہ کرنے کے سلسلہ میں اس بات کے قائل تھے کہ حقیقی اسلام کی طرف واپس آنا چاہئے اور اگر ایسا ہو جائے تو اسلامی سماج کی تمام مشکلات حل ہو جائیں گی۔وہ اس سلسلہ میں ''تولستوی'' (روس کا مشہور ادیب جس کی 'جنگ وصلح' نامی کتاب دنیا کی زندہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے) کے ہم خیال تھے۔عبدہ کے ہم عصر 'تولستی' کا کہنا تھا کہ حقیقی عیسائیت کی طرف پلٹنا چاہئے اور عیسائی سماج کی راہ علاج کو اسی میں منحصر سمجھتا تھا۔ درحقیقت مذاہب اسلامی کا اتحاد بلکہ اس سے بڑھ کر ادیان آسمانی کا اتحاد شیخ محمد عبدہ کی آرزوؤں میں سے تھا۔یہ بات اس وقت سے اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب انھوں نے اپنی عمر کا درمیانہ حصہ بیروت میں گزارا اور وہاں 'جمعیۃ التقریب بین الادیان والمذاہب'' نام کا ایک ادارہ قائم کیا۔اس ادارہ میں بہت سے علماء وادباء شریک تھے اور عیسائی لوگ بھی ان نشستوں میں آتے تھے۔وہ اس مرکز میں ادیان الٰہی کی وحدت کے سلسلہ میں گفتگو کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ تین اہم الٰہی ادیان یعنی اسلام، عیسائیت اور یہودیت کے پیروکاروں کو آپس میں بھائی

بھائی ہونا چاہئے۔ ان نشستوں کا اپنا ایک اثر ہوا یہاں تک کہ برطانیہ کے چرچ کا پادری 'اسحاق تیلوز' بھی اس ادارہ سے منسلک ہوگیا اور لندن میں بھی اسلام اور اس کی خوبیوں کے سلسلہ میں اس نے کچھ مقالات لکھے۔ (الامام محمد عبدہ رائد الاجتہاد والتجدید فی العصر الحدیث، ص/۲۰۶/۲۰۷؛ عثمان امین، وہی مدرک، ص/۷۷)۔

جب تک سید جمال مصر میں تھے تب ایک سایہ کی طرح محمد عبدہ ان کے افکار کی پیروی کرتے تھے لیکن طریقہ کار اور مقابلہ کی نوعیت کے بارے میں سید جمال کی طرح نہیں تھے۔ اپنی حیات فکری میں محمد عبدہ درمیانہ اور معتدل راستہ کا انتخاب کرتے تھے اگرچہ جب بھی سید جمال کے پاس ہوتے تھے تو سید کی شعلہ فشانی بھی آجاتی تھی اور ان کے قلم و زبان میں ایک نئی حرارت موجزن ہوتی تھی۔ اس کے باوجود سید جمال کے پیش نظر سیاسی جدوجہد کے سلسلہ میں محمد عبدہ کو ایک مکمل پابند فرد نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ وہ اندرونی اور گام بگام رفتار کی سفارش کرتے تھے۔

محمد عبدہ کے ذریعہ دینی اداروں میں مذہبی اصلاح کی آواز اس بات کا سبب بنی کہ الازہر یونیورسٹی کے روایتی بزرگ اور اساتید ان پر بے دینی اور شریعت کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کا الزام لگائیں۔ الازہر کے نصاب کی اصلاح، اجتہاد کی آزادی اور ان کے نئے فتوؤں نے مل کر الازہر والوں اور روایتی محفلوں کو ان کے خلاف کردیا۔ دوسری طرف برطانیہ کے خلاف مصر کے انقلابیوں کا ساتھ نہ دینا بھی اس بات کا سبب بنا کہ مصطفیٰ کامل کی طرح بہت سے لوگ انھیں برطانیہ کا ایجنٹ اور اس کی سیاست کا راستہ ہموار کرنے والا کہنے لگیں۔ اصلاح طلبی (اور میانہ روی) کی طرف محمد عبدہ کے تمایل نے دینی تحریک کو دو شاخوں میں تقسیم کردیا: کچھ لوگ سید جمال کے طریق کار کی پیروی کرنے لگے اور عظیم انقلاب کا مطالبہ کرنے لگے اور بعض عبدہ کی روش کے وفادار ہوگئے اور اندرونی اصلاح اور گام بگام حرکت کے خواہاں ہوگئے۔ (نہضت ہائے اسلامی در صد سالہ اخیر، ص/۳۷-۳۹)۔

سید جمال اور محمد عبدہ کی کوششوں کے نتائج

مسلمانوں کی تاریخ بیداری کے اوپر سید اور عبدہ کی تاثیر کے لحاظ سے ان دو عظیم انسان کی جدجہد کے

نتائج میں کافی فرق ہے۔سید جمال ایک مجاہد اور جفاکش انسان تھے اور عبدہ ایک متفکر اور معتدل انسان۔سید جمال مسلمانوں کی آزادی کو صرف ان کے فکری تحرک میں دیکھتے تھے اور عبدہ مسلمانوں کی دینی اور اخلاقی تربیت کے درپے تھے۔سید نے اپنی کوششوں کو تقریبا پوری دنیا میں پھیلا دیا تھا اور عبدہ نے زیادہ تر مصریوں کی حالت زار کی اصلاح کے لئے کوشش کی۔عبدہ کے مخاطبین زیادہ تر حوزہ و یونیورسٹی کے پڑھے لکھے افراد تھے اور ان کی محفلوں کا رنگ سو فیصد علمی تھا لیکن سید جمال کے مخاطبین سماج کے ہر طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور ہر شخص اپنے ظرف کے اعتبار سے کلام سید کا خوشہ چین تھا۔

شاید انھیں فرقوں کے لحاظ سے یہ کہنا بہتر ہوگا کہ سید اور عبدہ کی زحمتوں کا ماحصل ایک دوسرے کا متمّم تھا۔(سیری در اندیشہ سیاسی عرب،ص/۱۵۶)۔خصوصا یہ کہ دونوں افراد،حقیقی منابع فکری کی طرف بازگشت،احکام شریعت کی عقلی توجیہ اور روزمرہ کے مسائل سے ان کی ہم آہنگی،فرقہ بندی اور اختلاف سے پرہیز،اجتہاد کے احیاء کی تاکید اور دین اسلام کی روح و حقیقت کے سلسلہ میں سعی و کوشش کے بارے میں ہم خیال تھے۔(مجلّہ حوزہ،شمارہ۶۱/خلاصہ کے ساتھ)۔

غروب آفتاب زندگی

آخر کار ایک طولانی عرصہ تک علمی و سیاسی سعی و کوشش کے بعد شیخ محمد عبدہ ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ میں صاحب فراش ہو گئے۔ان کی معدہ اور جگر کی بیماری نے زور پکڑ لیا۔وہ ڈاکٹروں کی صلاح پر قاہرہ کے اسپتال سے اسکندریہ کے سرسبز و شاداب علاقہ میں منتقل ہو گئے اور اپنے بھائی کے گھر قیام پذیر ہوئے۔محمد عبدہ کی بیماری کی خبر پھیلنے کے سبب بہت سے بزرگ ان کی عیادت کے لئے آئے اور بعض نے ماہر ڈاکٹروں کو ان کے علاج کے لئے بھیجا۔لیکن شیخ کی بیماری بڑھتی ہی گئی اور ۸/جمادی الاولی ۱۳۲۳ھ کی شام کو پانچ بجے ۵۶/سال کی عمر میں ابدی نیند سو گئے۔(مدرس تبریزی،ریحانۃ الادب،ص/۹۶۔۹۸)۔

شہر اسکندریہ میں ہونے والی ان کی تشییع جنازہ میں اساتید، طلباء، سیاسی اور فوجی عہدیداران، الازہر کے بزرگان، عدالتی قوانین کے اعضائے مجلس، عدالت اوقاف کے اعضاء کے علاوہ مختلف طبقوں کے لوگ شریک تھے۔ اس کے بعد جنازہ کو الازہر یونیورسٹی میں لے جایا گیا اور شہر قاہرہ کے مناروں سے اذانوں کی آوازیں آنے لگیں۔ الازہر کے علماء و اساتید کے گریہ کی آوازیں تو نہیں آرہی تھیں لیکن ایک غم انگیز سکوت ہر چیز پر چھایا ہوا تھا۔ نماز جنازہ کے بعد ان کے جنازے کو ایک بار پھر اسکندریہ لے جایا گیا اور 'العفیفی' مقبرہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ اب بھی اس عظیم مصلح کی قبر پر ''ھو الحی الباقی'' لکھا ہوا ہے۔ (الشیخ محمد عبدہ، ص/۳۷۶-۳۸۲)۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ مِنَ النَّار

روزہ جہنم کی آگ کی سپر ہے۔

(اصول کافی، ج۴، ص۱۶۲)

عالم اسلام کا تعارف

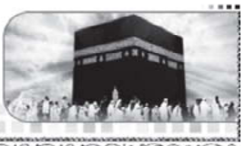

اسلام انڈونیشیا میں

عبدالمجید ناصری داوودی (دانشگاہ تاریخ وسیرہ اہلبیتؑ کے علمی پینل کے رکن)

ترجمہ: سید نجیب الحسن زیدی

خلاصہ:

انڈونیشیا کرہ زمین کا سب سے بڑا اجزائر کا مجموعہ ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا کا چوتھا سب سے زیادہ آبادی والا ملک ہے اور آبادی کے لحاظ سے اسلامی ممالک میں سب سے بڑا ملک مانا جاتا ہے

اس ملک میں دوسرے ممالک کی بہ نسبت دیر سے اسلام آنے کے باوجود اسلام آہستہ آہستہ اس کے تمام رہایشی جزیروں پر محیط ہو گیا قابل غور بات یہ ہے کہ اسلام کا یہاں پر ورود اور اس کی توسیع بھی بعض اسلامی مقامات کے برخلاف لشکر کشی کے ذریعہ نہ ہو کر صلح آمیز طریقہ اور اسلامی ثقافت کے بل بوتے پر ہوئی.

اسلام کی اندونیشیا میں آمد، اس کے رواج اور توسیع کا یہ طرز ایک طرف یہاں کے لوگوں کی ثقافتی زندگی اور اس خطہ کے لوگوں کے دین کے ساتھ لچک دار رویے اور دوسری طرف دیگر مذاہب کے مابین باہمی رابطوں کے پیش نظر بے اثر نہیں رہا ہے اس طرح کے اس ملک کے لوگوں نے اسلامی معارف سے گہرے رابطہ اور اس کی تعلیمات پر عمل کے ذریعہ اپنے وجود کو تشخص بخشا اور اسلام ان بکھرے ہوئے جزائر میں بسے مختلف حصوں میں بٹی ہوئی قوم کی شیرازہ بندی میں کامیاب رہا اسی بنیاد پر ان کا قومی اتحاد رنگ لایا۔

آج بھی استعمار کے یا ان کے داخلی پٹھوؤں کے ذریعہ جو مذہبی اختلافات پورے جہان اسلام میں دیکھنے میں آتے ہیں وہ انڈونیشیا میں مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان خواہ وہ شیعہ ہوں یا سنی نظر نہیں آتے ،اور لوگ دینی مشترکات پر بالخصوص پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت روز عاشور کی اہمیت اور اس کی یادگار منانے عرفانی اور دینی بزرگ شخصیتوں کے مزاروں کی زیارت اور معصومین علیہم السلام سے توسل کے سلسلہ میں اہتمام کرتے ہیں۔

دریچہ:

اسلامی جہاد یا دینی غزوات کے عنوان سے منظم اور منصوبہ بند طریقہ سے آس پاس کی امتوں پکر مسلمانوں کی فتوحات اور پیش روی کو سالوں سال گزر چکے تھے۔اور اب مسلمان فتوحات کے بجائے فرقوں میں

بٹنے کے ساتھ حکومت بنانے نیز ثقافتی جد و جہد کے ساتھ داخلی جنگوں میں مشغول تھے کہ اسلام کا نجات بخش آئین ایک ایسی سرزمین میں وارد ہوا جس نے آج سب سے بڑے اسلامی ملک کا اعزاز خود سے مخصوص کیا ہوا ہے۔

یہ دنیا کا سب سے بڑا جزیروں کا مجموعہ ہے جسے انڈونیشیا کے نام سے جانا جاتا ہے سب سے زیادہ مسلمانوں کی آبادی والا ایسا ملک جو مشرقی ایشیا کے جنوبی حصہ میں واقع ہے۔گزشتہ سالوں میں زلزلہ کی وجہ سے حیرت انگیز اور بے سابقہ سونامی کے سبب بہت زیادہ نقصان اٹھانے کی بنا پر لوگوں کے درمیان مشہور ہوا اور زبانوں پر اس کا نام چڑھ گیا۔

انڈونیشیا:

یہ ملک دریاے چین اور بحرہ الکاہل{Pacific ocean} کے جنوب اور بحرہ ہند {Indian ocean} کے شمال میں واقع ہے اس کے مشرق میں گائینا پاپ اور اس کے شمال میں ملیشیا ہیں اس کا طول ۲۴۸۰۰ مربع کلومیٹر اور عرض ۲۰۰۰ کلومیٹر ہے چین، ہندوستان اور امریکہ کے بعد یہ دنیا کی سب سے زیادہ آبادی والا ملک جانا جاتا ہے اس لحاظ سے دنیا کے ممالک میں چوتھے مقام کا حامل ہے. آخری رائے شماری کے مطابق ۲۲۲ ملین (۲۲ کروڑ ۲۰ لاکھ) لوگ اس میں رہتے ہیں۔ [۱]

یہ ملک ۱۳ ہزار سے زیادہ چھوٹے بڑے جزیروں پر مشتمل ہے جس میں سے صرف چھ ہزار جزیروں میں لوگ رہتے ہیں یہ بات صرف بکھرے ہوئے متعدد غیر رہایشی علاقوں پر مشتمل جزیروں سے مخصوص نہیں بلکہ رہایشی جزیروں میں بھی آبادی کا تناسب نظر نہیں آتا.

آبادی کا عدم تناسب اس کی نابرابری اور کسی ایک مخصوص علاقہ میں لوگوں کا اژدہام اور دیگر افراد کا الگ الگ مقامات پر بکھرا ہوا ہونا اس طرح کہ ۶۰ رفیصد پورے ملک کی آبادی جاوہ نامی جزائر میں رہتی ہے تو ۴۰ رفی صد بقیہ ۱۲ رہزار سے زیادہ جزائر میں رہایش پذیر ہیں اور یہ خود اس ملک کا ایک مسئلہ ہے ۔

انڈونیشیا میں ۲۰۰ علاقائی زبانیں اور ۳۸۰ لہجہ پائے جاتے ہیں اور اتنی ہی قومیں یہاں زندگی بسر کر رہی ہیں بنیادی قومی دستور العمل کی اصل ۳۰۶ کے مطابق انڈونیشیائی زبان اس ملک کی رسمی زبان ہے اور دیگر زبانیں اور لہجے غیر رسمی ہیں کہ جنھیں مقامی زبان کے طور پر جانا جاتا ہے۔

ان میں سے اہم زبانیں آچائی {Acehenese} ، باٹا کی {Batak}{ ، سیونڈیٹ { sundanese}، جیوہ ای ، ساسا کی {Sasaks} دیا کی ،ٹٹوم {Tetum}میز ہیز ،ٹور چا سرامیز ، ہلماہیراسی {Hallmachera} ہیں۔۲

اسلام کا ورود:

انڈونیشیا کے جزائر کا مجموعہ بالخصوص جاوہ {JAWA} کا علاقہ دنیا کے قدیمی رہائشی علاقوں میں شمار ہوتا ہے تقریبا ۱۳ ر ہزار سال پہلے حتی دور حجر اور آلات جنگی کے وجود میں آنے سے بھی پہلے جاوہ {JAWA} میں انسانی زندگی کا وجود درج ہے۔ تاریخی اسناد انڈونیشیا کے جزیروں کے ساکنوں کے چینیوں سے روابط کو بیان کرتی ہیں، جس کی بازگشت عصر مسیحیت پر ہوتی ہے.

ان تمام باتوں کے باوجود سب سے زیادہ ثقافتی تاثر آنے والے ادوار میں ہندوستان کے باشندوں نے چھوڑا. ہندوستان کے لوگوں نے تجارتی روابط اور ہجرت کے ذریعہ اس سرزمین کو ہندوستان میں موجود دیگر ادیان اور فرقوں ہندوئیزم، بودیزم کے عقاید سے متاثر کیا اس طرح کہ بودھ کے اہم مجسموں کو برصغیر کی جگہ اندونیشیا میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔۳ انڈونیشیا میں اسلام کے ورود کی تاریخ کی واضح اور قابل اعتماد اسناد نہیں ہیں بعض اسے چوتھی ہجری صدی مانتے ہیں اگر چہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ چوتھی صدی میں ہی اسلام وسیع پیمانہ پر یہ پھیلا جب کہ کچھ لوگوں نے پورے ملک میں اس کے پھیلنے اور تیزی کے ساتھ اس کے رشد کی طرف اشارہ کیا اور لکھا ہے:

''اسلام پندرہویں عیسوی صدی میں میں تیزی کے ساتھ پورے انڈونیشیا میں پھیلا اور اس کے رواج

میں توسیع ہوئی۔

یہ نیا دین مغرب کی جانب سے جزائر تک پہونچا۔لہذا آج کے مورخین اپنی توجہ کو ایشیائی تجارت کی اس بڑی گزرگاہ پر مبذول کرتے ہیں جو سوماترا اور ایشیا کے آبنائے پر مشتمل ہے۔[۴]

اسلام پندرہویں صدی میں نہ صرف ملاکا {Malacca} کے علاقہ میں تیزی کے ساتھ پھیلا اور وہاں کے لوگوں کے دلوں کو تسخیر کرنے میں کامیاب رہا بلکہ حکومت سے بھی نزدیک ہوا لہذا موجودہ اسناد کے مطابق ۱۴۱۹ ہجری میں چین کا دورہ کرنے والا ملاکا کا حاکم شاہ محمد اسکندر نامی ایک مسلمان شخص تھا اگرچہ یہ بات واضح نہیں ہے کہ وہ اس علاقہ بازماندہ سلطانوں میں تھا کہ جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا یا پھر وہ ایک ایسا مسلمان تھا جسے اس جزیرہ پر حکمرانی کی توفیق نصیب ہوئی اور اپنے ماقبل غیر مسلمان سلاطین کا جانشین قرار پایا۔

صلح پسندانہ اور ثقافتی داخلہ:

انڈونیشیا میں اسلام کے ابتدائی دور اور اس کی توسیع کے طریقہ کار و مراحل کے سلسلہ میں چنداں اسناد نہیں ہیں اس کے باوجود اس سرزمین میں اسلام کے صلح پسندانہ داخلہ کے سلسلہ میں کسی بھی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں ہے زیادہ تر مسلمان تاجروں کی انڈونیشیا اور مسلمان علاقوں خاص طور پر برصغیر اور اس کے اطراف میں تجارتی رفت وآمد کی بنا پر اسلام کی توسیع ممکن ہوسکی۔[۵] محققین اس بات پر تاکید کرتے ہیں کہ عیسائی مبلغوں کے برخلاف یہ مسلمان تاجر دین اسلام کی انڈونیشیا کے جزائر میں ترویج وتبلیغ کے لئے تبلیغی تقاضوں کے مطابق پروگراموں اور معین لائحہ عمل کے حامل نہ تھے جبکہ اسی دوران عیسائیوں کے مختلف تبشیری گروہ (دین عیسی کے پیرو کے لئے نجات کی بشارت دینے والے) اپنی فعالیت انجام دے رہے تھے اور اپنے آئین کی ترویج میں مشغول تھے البتہ اسلام کے رسوخ اور نفوذ کے مقابل انھیں کوئی خاص کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔نتیجہ میں انھوں نے اپنی فعالیت کو جاری رکھنے اور ٹھہرنے پر وہاں سے کوچ کر جانے کو ترجیح دی۔

''اس عقیدہ کو کہ جدید دین تبلیغی کارکردگی کی بنیاد پر مشرقی ایشیا کے جنوب میں پہونچا'' کو بالائے طاق رکھا جا سکتا ہے .خود ''تبلیغی'' لفظ ہی صحیح نہیں ہے اور مشتبہ ہے آخر کے چند سالوں تک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کبھی بھی پہلے سے طے شدہ تبلیغی پروگراموں کے ذریعہ نہیں پھیلی تھیں .آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیروکاروں نے منظّم سماج کی تشکیل نہیں دی اوران کے پاس کوئی منظّم روحانی طبقہ بھی نہیں تھا...

بعض موارد میں اسلام کی طرف میلان کا سرچشمہ اعتقاد وعقیدہ ہوتا تو بعض مقامات پر کچھ دوسرے غیر مذہبی محرکات کا حاصل رہا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ گجرات سے انڈونیشیا کو آنے والے تاجر اپنے دین کی ترویج کے لئے نہیں'' آتے تھے۔[٦] اسلام کی توسیع کے ساتھ ساتھ مصنف عیسائی مبلغوں کی تبشیری فعالیت کے سلسلہ میں بیان کرتے ہیں کہ ناکامی ان کے ہاتھ لگی اور کچھ مدت بات انھوں نے علاقہ کو چھوڑ دیا حتی انڈونیشیا کے لوگوں کی طرف سے اسلام خواہی کی لہر کو بھی اپنے میدان میں تمام ترنظم وتجربہ اورعلم آ گاہی رکھنے کے باوجود روکنے میں ناکام رہے۔

مجموعی طور پر یہ چیز اس امر کو بیان کررہی ہے کہ مشرقی ایشیا کا جنوبی حصہ جس میں دنیا کا سب سے زیادہ مسلم آبادی والا ملک بھی شامل ہے صلح آمیز ثقافتی طریق کار کی بنیاد پر اسلام کے نجات بخش آئین کی طرف آ گیا اور آخری دہائیوں میں لوگوں کی طرف سے اس کے وسیع استقبال نے پورے خطے میں اس کی ترویج کے ساتھ اسکو اکثریت کا دین بنادیا۔

اسلام سوماترا کے ذریعہ انڈونیشیا میں داخل ہوا اس کے بعد جاوہ پہونچا ١٥١١ء میں پرتگالیوں کے ذریعہ ملاکا پر تسلط اس بات کا باعث بنا کہ مسلمان تاجر مشرقی ایشیاء کے جنوبی علاقوں میں پھیل جائیں اور لوگوں کے اسلام میں داخل ہونے کا سبب بنیں، معروف مقولہ ''دشمن بھی کرے خیر اگر چاہے خدا تو'' کے مطابق اسلام کا نفوذ ان علاقوں میں زیادہ تھا جو ہندو تمدن سے ذرا کم متاثر ہوئے تھے، جیسے جاوہ کے مرکزی اور شمالی ساحلی علاقے ،مغربی

جاوہ میں باٹن سومترا کے مغرب اور شمال میں آچہ اور مینانگ کابود ماک جاوہ کا سب سے پہلا شہر تھا جس نے ۱۴۷۷ء میں اسلام قبول کیا اس کے بعد ۱۴۸۰ء میں سیر بون نے اسلام قبول کیا۔

مسلمان شہزادوں نے ۱۴۸۷ء میں ماجاپاہت کی بچی کچی سلطنت پر حملہ بول دیا اور پندرہویں صدی کے آخر میں اسکو ختم کر دیا جس کے نتیجہ میں پورے جزائر کے مجموعہ میں ۲۰ مسلمان حکومتیں وجود میں آئیں

سوئیز کینال کے افتتاح اور انڈونیشیائیوں کے مکہ کی زیارت کا شرف حاصل کرنے کے بعد اصولی انداز میں اسلام اس ملک میں داخل ہوا. انڈونیشیائی حجاج جب مسلمانوں کے زندگی گزارنے کے طور طریقوں سے آگاہ ہوئے اور جب انھوں نے مسلمانوں کی تہذیب اور آداب اسلامی کو سیکھا تو مثبت تبدیلی کے ساتھ ایک روشن زاویہ نظر کے حامل ہوئے، انھوں نے اپنے اس تجربہ اور فہم کو ثقافتی تحفہ کے طور پر اپنے ملک منتقل کیا اور مثبت آثار کا سرچشمہ ہونے کے ساتھ لوگوں کے بہتر اسلامی شعور کا باعث بنے۔

البتہ ذکر شدہ حجاج نے بھی اس سلسلہ میں فعال کردار ادا کیا اور مختلف سمیناروں کے انعقاد کے ذریعہ مختلف علاقوں کے لوگوں خصوصا دینی رہبروں کے عقائد اور میلانات کی اصلاح اوران کی معلومات میں اضافہ کرنے میں کامیاب رہے۔ ۷بعض مصنفین کے نظریہ کے مطابق یہ حجاج اسلامی علم و دانش سے بھی مالا مال تھے اور انڈونیشیاء کے دینی اور روحانی علماء کا حصہ تھے اس کے علاوہ خانہ خدا کی زیارت علوم دینی کی تحصیل اور مطالعہ کے لئے انھوں نے عرب کے بہت سے سفر کئے اور انڈونیشیاء کو اصلاح پسندوں کی تعلیم سے آشنا کیا۔

ان کے اسلامی شعور کو بڑھایا انھیں تمام دنیا کے مسلمانوں کی یورپی استعمار کی مخالفت سے آشنا کیا۔ یہ حجاج کرام اپنے ملک واپسی پر سیاسی خود مختاری کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی مذہبی زندگی کی تقویت کا عہد کرتے اور یہ آرزو کرتے تھے کہ ان کے دینی بھائی گمراہی سے راہ راست کی طرف ہدایت پا جائیں۔۸

یہ رپورٹیں اس بات کی غماز ہیں کہ بیسویں صدی میں جب کہ یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ مغربی لیبرل

ڈیموکریسی کی تہذیب کی روز افزوں بڑھت ایک طرف تو دوسری طرف کمیونزم کے کھلے بیل کی پیشروی دنیا میں اسلام کے نفوذ کے لئے رکاوٹ پیدا کریں گی مشرقی ایشیا کے جنوبی لوگوں نے خود کو اس دور میں وہاں کے علاقائی ،تمدن نیز ہندوستانی اور چینی افکار کے جالوں سے چھڑا کر مغربی فلسفوں کی طرف دھیان دیئے بغیر اسلام کی معنویت کا رخ کیا اور دین اسلام کا استقبال کیا۔

دین اسلام انڈونیشیا کو استعمار کے پنجہ سے نجات دلانے والا آئین:

مشرقی جنوبی ایشیا کی سرزمینوں جس میں انڈونیشیاء کا مجموعہ جزائر بھی شامل ہے، کا استعمار بھی دیگر استعمار کے قبضہ میں رہنے والی سرزمینوں کی طرح عبرت آموز تاریخ کا حامل ہے اور مغرب کے گزشتہ سیاسی تمدن کے سیاہ صفحہ کے ساتھ علاقائی لوگوں کی جانب سے بالخصوص مسلمانوں کی جانب سے مقابلہ آرائی اور ان کی رزم آفرینی سے مخصوص ہے.

پرتگالیوں نے اور انھیں کی پیروی کرتے ہوئے ہسپانیوں نے کہ جنھیں مسلمانوں کے قتل کے ساتھ اسلام کو مٹانے میں طولانی اور کامیاب تجربہ رہا ہے اور وہ اسی تجربہ کی بنیاد پر اندلس کے اسلامی علاقہ کو مذہبی اور نسلی اعتبار سے انسانیت کے منافی گوناگوں سیاست کے ذریعہ اسپین کو مسلمانوں سے مکمل طور پر خالی کرانے یا ان کے آئین کی تبدیلی اور مسیحیت کی قبولیت پر مجبور کرنے کی روش پر عمل کرتے ہوئے مسلمانوں کا صفایا کرنے میں کامیاب رہے تھے۔

انڈونیشیا میں اس وقت جب اس کے زیادہ تر رہنے والے غیر مسلم تھے اور اسلام تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا اسپانیائی ایسے ہی خواب وخیال کا سودا سر میں لئے بیٹھے تھے. چنانچہ ہندوستان اور ایشیا کے جنوب کے ساحلوں تک پہنچ کر انھوں نے ۱۵۱۱ء کو اپنے بیڑوں کو مالاکا قلعہ پر قبضہ کرنے کے لئے آبنائے ملاکا تک {Strait:of malacca,Isthmus} بھیجا اور وہاں کی اسلامی حکومت کو مغلوب کرنے کے بعد انڈونیشیا کے پانی میں

داخل ہو گئے زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ ہالینڈ کے تاجروں نے پہلی بار ۱۵۹۲ء میں انڈونیشیا کا رخ کیا اور ۱۵۹۵ء تک ادویہ جات، (مصالحوں اور دواؤں) کی تجارت میں مشغول رہے۔

ہالینڈ کی حکومت نے ۱۶۰۲ء میں ہالینڈ کی ایسٹ کمپنی {V.O.C.} کی بنیاد رکھی تا کہ امید نیک (جنوبی افریقا) کے دروازہ کے مشرق میں واقع علاقوں اور مغرب میں آبنائے ماژلان (جنوبی امریکہ) تک تجارت اور حکومت کریں [۹] جیسا کہ اشارہ ہوا اس جزائر کے مجموعہ پر استعمار کے ورود اور ان کی توسیع پسند جدوجہد اور غارت گری نہ صرف یہ کہ لوگوں کے اسلام کی طرف رجحان میں کوئی میں خلل کا باعث بن سکی بلکہ لوگوں کو یہ بات آہستہ آہستہ معلوم ہوتی گئی کہ ان کے ملک کی نجات کا واحد راستہ اسلام کے دامن میں پناہ لینا اور اسلامی تعلیمات کے سایہ میں اپنی صفوں کو متحد کرنا ہے۔ اسلام کی قبولیت اور اس کے مفاہیم ہی کی بنیاد پر عوام کی استقلال وحریت پسند تحریک میں جان آ گئی اور مزید جدوجہد اور سعی وتلاش کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

جس قدر استعمار آگے بڑھ رہا تھا اور اپنے تسلط کو گہرا اور مظبوط بنا رہا تھا اسی قدر اسلام بھی دلوں کو تسخیر کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے اندر قومی اور دینی حمیت کو بیدار کرنے کے ساتھ دشمن سے نبرآزمائی کا حوصلہ اور اس سے مقابلہ کے احساس کو بیدار کر رہا تھا اس سے قبل کہ استعمار پورے جزائر کے مجموعہ کو اپنے قبضہ میں لے لے تقریبا انڈونیشیا کی ۹۰ فی صد آبادی مسلمان ہو چکی تھی۔[۱۰]

استقلال کی لڑائی لڑنے والی تنظیموں کی تاسیس وتشکیل:

انڈونیشا میں آزادی کی لڑائی لڑنے والی سیاسی پارٹیوں کی تاریخ بھی آزادی کی جنگ اور استعمار سے مقابلہ کے ساتھ رچی بسی ہے اور عوام نے اپنی لڑائی کو منظّم طور پر لڑنے کے لئے متعدد تنظیمیں اور انجمنیں بنائیں۔ اس لحاظ سے انڈونیشیا کے استقلال اور وہاں سے استعمار کے نکلنے کا راز بھی دینی زاویہ نظر اور اسلام کے نجات آفریں آئین کی پیروی میں پوشیدہ ہے۔

اسلام نے سب سے پہلے ان بکھرے ہوئے جزائر کے مجموعہ کو جوایک دوسرے سے جدا جدا تھا ایک تشخص عطا کیا اور قومی اتحاد کو بارور بنایا اس کے بعد ان کی بند مٹھیوں کو ہالینڈ کے استعمار کے خلاف محکم اور مضبوط بنادیا۔

''انیسویں صدی کے درمیان تک برطانیہ اور ہالینڈ نے اپنی سلطنت کے دائرہ کو انڈونیشیا کے کے علاقوں اور ملایا تک پھیلا دیا تھا.

اس علاقہ کے مسلمان ابھی ایک متحد تمدن یا سلطنت کے کسی حصہ کو تشکیل نہیں دے پائے تھے بلکہ مختلف لسانی اور قومی طبقوں میں بٹے ہونے کے ساتھ مختلف اور بہت سے الگ الگ صوبوں میں تقسیم تھے۔

صرف انیسویں صدی کے آخر میں یہ ہوا کہ ہالینڈ اور برطانیہ کا تسلط وہاں کی سیاسی اور اقتصادی زندگی میں گہرے تبدل اور تغیر کا سبب بنا اسی بناپر اغیار کی طرف سے داخلی مسائل میں مداخلت کے سبب مسلمانوں اور نیشنلسٹوں کی جانب سے ردعمل سامنے آیا۔

سنی علماء،صوفی معلم،سیاسی ماضی رکھنے والے سربرآوردہ خواص لوگ،انڈونیشیا کے روشن فکروں اور جدید مدیروں کا طبقہ، اصلاح پسند،مسلمان اور سرانجام ریڈیکل طرز فکر رکھنے والے عسکری رہبران ،سب کے سب انڈونیشیاء اور مالایا کے مستقبل کو دکھتے ہوئے اپنے حق کا مطالبہ کررہے تھے''۔[۱۱]

مذکورہ مصنف ایک دوسری جگہ کہتے ہیں:

''ہالینڈ کی اپنی جگہ بنا چکی حکومت اور وہاں اونچے طبقہ کو لے کر سب سے پہلا ردعمل جو اس اونچے طبقہ کے زوال کا سبب بنا مسلم معاشروں کے سامنے آیا۔

طاقت کا ناپائدار توازن خواص کے لئے مخالفت کی فضا بنانے کا سبب بنا۔

دیہاتوں میں رہنے والے لوگوں کی لڑائی بھی وہاں کی دینی پیشواؤں کی رہبری میں سے ۱۸۲۰ء۔

۱۸۳۰ء تک ہونے والی جاوا کی جنگ کے ساتھ شروع ہوگئی۔۱۲

ان تمام باتوں کے باوجود استعمار کے خلاف مسلمانوں کی لڑائی کی تاریخ کی بازگشت تقریباً اس سے بھی ۲ صدیوں پہلے کی طرف ہوتی ہے۔

حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو انڈونیشا کی خاک میں قدم رکھتے ہی استعمار کو وہاں کے مسلمانوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے بعد انڈونیشیا میں دراندازی اور پیشرفت نیز اپنے ٹھکانوں کو مظبوط کرنے کے بعد بھی استعمار کبھی بھی مسلمانوں کی رضا مندی کو اپنی طرف مبذول کرنے یا انھیں صلح پر آمادہ کرنے یا الگ تھلگ کرنے پر کامیاب نہ ہوسکا۔

مسلمانوں کی آزادی کی اہم جنگیں ۱۶۲۹ء تک الونگ ہونگوسیمو کی رہبری میں جاری رہیں ان کے بعد سلطان عبدلفتاح سامنے آئے اور انھوں نے استقلال پسند طاقتوں کو منظم کرنے کے ساتھ ان کی رہبری کی۔

جیسے جیسے استعمار کے خلاف مسلمانوں کی لڑائی زور پکڑتی جا رہی تھی اور آگے بڑھ رہی تھی اتنا ہی مسلمانوں کے اوپر نبرد آزمائی کے جدید اور نئے تجربات کے راز کھلتے جا رہے تھے کہ تجربہ کار، تربیت یافتہ اور منسجم انجمنوں اور تنظیموں کا نظم ونسق انھیں میں سے ایک تھا۔

چنانچہ اسی کے مدنظر آہستہ آہستہ اسلامی مقصد اور اسلامی نقطہ نظر کے ساتھ کچھ پارٹیاں انڈونیشیا کے میدان سیاست اور دشمن سے مقابلہ آرائی کے میدان پر بھی ظاہر ہوئیں۔

ان اہم پارٹیوں میں حزب اللہ اور سبیل اللہ کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے، جنھوں نے ہالینڈی استعمار کے دراندازوں کو کھدیرنے یا یا ان کی دوبارہ دراندازی پر ان کا قلع قمع کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔۱۳ اس کے بعد آنے والے سالوں میں بالخصوص ۱۹۴۵ء میں انڈونیشیا کے مسلمانوں نے ایک بڑی اور اہم پارٹی ''ماشومی'' کی تاسیس کی اور تمام اہم اجتماعی اور فرہنگی تنظیموں کو اس میں شامل کیا انھوں نے یہ وعدہ دیا کہ ماشومی مسلمانوں کی واحد

سیاسی پارٹی رہے گی۔

یہ پارٹی ۱۹۵۲ء تک انڈونیشیا کی دو بڑی پارٹیوں کے عنوان سے جانی جاتی رہی دوسری پارٹی جو قوم پرستی اور نیشنلزم کا رجحان رکھتی تھی لیکن دینی لحاظ سے دین کی مخالف نہیں تھی بلکہ عام طور پر انڈونیشیا کے لوگوں کے معنوی اور دینی رجحان کو دیکھتے ہوئے اس کا مطمح نظر غیر جانبدارانہ تھا۔

یہ سب کچھ اس حال میں ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے دینی، اور فرہنگی کارکردگی کے پیش نظر متعدد تنظیمیں وجود میں آئیں جنھوں نے انڈونیشیا سے استعمار کے خلاف مقابلہ اسکی نابودی اور اپنے ملکی کے استقلال میں اہم کردار ادا کیا۔

ان میں سے ۱۹۱۲ء میں انجمن محمدیہ کی تاسیس کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے، جس کا مقصد دینی فعالیت کے ساتھ اسلامی تبلیغات کو نظم بخشنا اور معنویت کے مشتاق اور معارف اسلامی کے تشنہ لوگوں کو بہتر سے بہتر طور پر اسلام کو پہنچوانا تھا۔[۱۴]

اس طرح صرف عسکری محاذ نہیں تھا جہاں انڈونیشا کے مسلمان فعال ہوں اور اقتدا عمل ان کے ہاتھوں میں ہو بلکہ سیاسی میدان میں سیاسی لیڈران فعال تھے۔یہی وجہ تھی کہ ماشومی پارٹی سے محمد روئم (Roem) انقلاب کے مختلف مراحل میں انڈونیشیا آنے والے تمام وفود سے مذاکرات کے لئے ہالینڈیوں کے ساتھ میز پر موجود ہوتے تھے۔

محمد ۱۹۴۹ء مارچ کے مہینہ میں ہالینڈ سے بھیجے گئے ۔جی، ایچ، فن راین، کے ساتھ نتیجۂ مطلوب تک پہنچنے میں کامیاب رہے کہ یہ کام جکارتا کی جمہوری حکومت کی بازگشت کی راہ ہموار کرنے میں کامیاب رہا ۱۹۴۹ء کے اواخر میں ہالینڈ میں ہونے والی گول میز کانفرنس انڈونشیا کو حکومت کے منتقل ہونے کا باعث ہوئی۔[۱۵] خود محمد روئم اس گول میز کانفرنس میں بھیجے گئے وفد کے صدر تھے۔

انڈونیشیا کے استقلال کے بعد دینی رہبروں کا کردار :

۱۹۴۹ء میں انڈونیشیا کے مستقل ہونے کے بعد تک بھی دینی رہبران اور روشن فکر شخصیات حکومت سے دور نہ رہیں حتی ان کے نیشنلسٹ رقبا اپنی حکومت کو قانونی حیثیت بخشنے کے لئے اور لوگوں کو حکومت سے راضی رکھنے کے لئے ان کی شراکت کے نیاز مند تھے۔

''سوکارنو کی (انڈونیشیا کی استقلال پسند تحریک کے رہبروں میں سے ایک اور وہاں کے سابقہ صدر جمہوریہ) نظر کے مطابق نہضت العلما{.N.U} کی حکومت میں شرکت اس بات میں معاون رہی کہ ان کے لئے ہر طرح کی کمیونسٹی رجحان رکھنے یا اسلام مخالف ہونے کی تہمتیں بے اثر ہوجائیں [۱۶]

بیرونی محققین اور ناظرین بھی اس بات پر تاکید کرتے ہیں ہے اسلام نے انڈونیشیا میں صرف کمیت کے لحاظ سے بڑھت حاصل نہیں کی بلکہ اس سے زیادہ عمودی طور پر اور کیفیت کے حساب سے بھی انڈونشیا کے لوگوں کے دل و جان میں گھر کیا ہے۔

اس طرح کہ فوجیوں اور سیاستمداروں نے اس بات کا بخوبی اندازہ لگالیا کہ دینی اقدار سے لاتعلق ہوکر سیاسی ثبات یا امنیتی مسایل میں انھیں کچھ نصیب نہیں ہونے والا ہے۔اس طرح واحد وہ چیز جو کمیونزم کے سیلاب کے آگے دیوار بن کے حائل ہوسکتی ہے وہ ملک کے سیاسی رہبروں اور عمائدین کی اسلامی بصیرت اور لوگوں کے اعتماد کو حاصل کرنے کے لئے دینی رہبروں اور سلامی تنظیموں کی حکومت میں شمولیت ہے۔

انڈونیشیا کے سابقہ فوجی لیڈر سوہارتو نے بھی حصول حکومت اور اس کی پائداری اور استمرار کے کئے ہر چیز سے زیادہ اسلامی طاقت اور دینی تنظیموں پر تکیہ کیا۔ان کے اعتماد کو حاصل کرنے کے ذریعہ ہی وہ اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے اور حکومت تک پہنچنے میں کامیاب رہے۔

سوہارتو کے بعد جیسا کہ گزشتہ چند سالوں میں ہم نے دیکھا انڈونیشیا کی نہضت العلماء کے رہبر عبد

الرحمان وحید بھی پارلمنٹ کے اکثر اراکین کے میگاوتی سوہارتو پوتری سے تعلق رکھنے کے باوجود صدر جمہوریہ بنے اور پیرانہ سالی کے باوجود کچھ مدت تک حکومت کی۔ ۱۷

انڈونیشا کی تہذیبی اور مذہبی صورت حال:

ان تمام نشیب وفراز کے باوجود جو گزشتہ چند سالوں میں انڈونیشیا کی تاریخ نے دیکھے آج بھی انڈونیشا کے لوگ دنیا کے اصول پسند اور راسخ العقیدہ مسلمان مانے جاتے ہیں. یہ لوگ صلح آمیز طریقہ سے اسلام کے ان کی سرزمین میں داخلہ کی بنا پر اس تعصب اور افراط کے مخالف ہیں جو خشک فکر اور کٹر تنظیموں کی جانب سے مختلف اسلامی معاشروں تک منتقل ہوتا ہے۔

چنانچہ گزشتہ دہائیوں میں اس سلسلہ میں بے حساب سرمایہ کاری کے باوجود انڈونیشا کے مسلمان بہت کم متاثر ہوئے بالکل اسی طرح جسطرح انڈونیشیا کے مسلمانوں نے مغربی امدادرسانوں کے مختلف بہانوں، جیسے زلزلہ، سونامی، کے ذریعہ عیسائیت کی تبلیغ وترویج سے متاثر ہوئے بغیر اسکا مقابلہ کیا اور انھیں خالی ہاتھ ان کے گھر لوٹنے پر مجبور کردیا۔

انڈونیشیا میں اس وقت ۵۵۰ مساجد ہیں، کثیر تعداد میں مساجد کے باوجود بہت سے اسلامی علاقہ نمازیوں اور عبادگزاروں سے چھلکتے نظر آتے ہیں۔

انڈونیشیا کے اکثر مسلمان شافعی مذہب کے پیرو ہیں اگرچہ کچھ دوسرے اسلامی فرقے اور مذاہب بھی ہیں جیسے حنفی، حنبلی، مالکی، جعفری، زیدی، اسماعیلی اس کے علاوہ کچھ تصوف کے فرقے بھی پائے جاتے ہیں جن میں نقشبندی، اور تیجانی فرقوں کو بیان کیا جا سکتا ہے۔

اس ملک کے ایک محقق لکھتے ہیں:

انڈونیشیا کے اکثر مسلمان شافعی مذہب کے پیرو ہیں اور دیگر وہ فرقے جنکی تعداد لائق توجہ ہے وہ حنفی،

حنبلی، شیعہ اثناعشری، زیدی، علوی ہیں کچھ دیگر صوفی طریقت پر عمل کرنے والے جیسے نقشبندی، تیجانی، سے تعلق رکھتے ہیں۔

انڈونیشیا کے مسلمان مذہبی اور دینی اقدار کے پابند لوگ ہیں اور یہ بات اس ملک میں مساجد کی کثرت سے ثابت کی جاسکتی ہے۔۱۸

انڈونیشیا کے اسلامی فرقوں کی باہمی رواداری:

انڈونیشیا متعدد اسلامی فرقوں کے باہمی رابطوں کے لحاظ سے درخشاں ماضی کا حامل ہے۔جیسا کہ اشارہ ہوا استعمار کی پیش روی اور غارت گری، ظلم اور بے رحمانہ طرز سلوک کے ساتھ اس کی مفاد پرستی کے مقابل اسلام لوگوں کے قرطاس دل پر چھاتا چلا گیا اور اس نے الگ تھلگ پڑے ہوئے لوگوں کو ایک تشخص عطا کیا اور ان کی ہدایت کی اور استعمار سے مقابلہ کے لئے ان کے استقلال و حریت پسندی کے جذبہ کو ابھارا اور بڑھاوا دیا۔

جس طرح اس ملک میں اسلام صلح آمیز اور ثقافتی مطمح نظر کے ساتھ داخل ہوا اسی طرح انڈونیشیا کے لوگ بھی ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ تعصب و تندروی سے پرہیز کرتے ہوئے خوشگوار روابط کے حامل رہے۔

زیادہ تر اسلامی مشترکات من جملہ قرآن واہلبیت اطہار علیہم السلام کی محوریت پر زور دیتے رہے اور ایک دوسرے کے ساتھ متحد رہے۔

اسلامی مذاہب خصوصا مذہب تشیع و تسنن شروع سے ہی ایک ساتھ مشرقی ایشیا کے جنوب من جملہ انڈونیشیا میں داخل ہوئے اور اس کے مختلف جزیروں میں انھوں نے رسوخ حاصل کیا۔

شیعہ کلچر سے متاثر انڈونیشیا کی پہلی اسلامی حکومت انڈونیشیا کے باسامی کہے جانے والے ایک جزیرہ میں جو آچا صوبہ سے تعلق رکھتا ہے تشکیل پائی۔

اس لحاظ سے انڈونشیا میں شیعت ایک خالص اور نجات بخش مذہب کے عنوان سے پہچانا جاتا رہا اور

مختلف اسلامی فرقے شیعت کوایک خاص احترام سے دیکھتے ہیں ۔

انڈونیشیا میں مختلف اسلامی فرقہ پائے جاتے ہیں جن کی اکثریت شافعی مذہب ہے لیکن عملی طور پر اور شعائر اسلامی پر عمل میں لوگوں کا عمومی کلچر بعض دیگر جگہوں پر ان کے علاقائی تہذیب سے متاثر ہونے کے ساتھ مجموعی طور پر اہلبیت علیہم السلام کی پیروی کے فرہنگ سے متاثر ہے اوراسی میں رچا بسا ہے۔

توسل ، دعا ، زیارت اہل قبور ، خاص طور پر بعض سادات کرام اور مشہور عرفانی علماء کی زیارت کے پروگرام جن میں جشن بعثت کے ساتھ اولیاء اللہ کی ولادت حتی سیدالشہدا علیہ السلام کی عزاداری کے پروگرام بھی شامل ہیں یہ تمام پروگرام لوگوں کے دینی پروگراموں کا حصہ اور جز ہیں جو تمام لوگوں کے درمیان رائج ہیں اور مختلف طایفوں کے درمیان ان پروگراموں میں کوئی بہت بڑا فرق محسوس نہیں ہوتا ہے۔

یہ خصوصیت اس بات کا سبب بنی ہے کہ بعض اہل سنت کے مشہور رھبران انڈونیشا کی قوم کے فرہنگ کو اہل تشیع کے فرہنگ سے متاثر سمجھیں۔

انڈونیشیا کی بڑی تنظیم جمیعت نہضت العلما کے رہبر اور انڈونیشا کے سابق صدر جمہوریہ عبدالرحمان وحید جن کا تعلق اہل سنت سے ہے کہتے ہیں ''جمیعت نہضت العلماء اہل سنت والجماعت کی تعلیمات کی پیرو ہے اگرچہ عملی طور پر شیعہ فرہنگ کی تقلید کرتی ہے۔ ۱۹

جیسا کہ اشارہ ہوا انڈونیشیا میں جمیعت نہضت العلما {N.U} سب سے بڑی دینی تنظیم شمار ہوتی ہے اور تقریبا ۳۰ ر۴۰ ملین طرفداروں پر مشتمل ہے۔ جس نے انڈونیشیا کے استقلال سے قبل اور اس کے بعد وہاں کی تاریخ میں نمایاں رول ادا کیا چنانچہ اس تنظیم کے رہبر ایک بار صدر جمہوریہ کے منصب پر بھی فائز ہوئے۔

انڈونیشا میں منعقد ہونے والے معروف یادگاری اور سالانہ پرگراموں میں ایک عشرہ محرم اور عزاداری کا یادگار پروگرام ہے. انڈونیشیا کے مسلمان امام حسینؑ اور آپکے باوفا ساتھیوں کی سالانہ یاد خاص اہتمام اور تزک و

احتشام کے ساتھ مناتے ہیں۔محرم اورصفرانڈونیشائی قوم کے لئے خاص اہمیت کے حامل ہیں عموما مختلف مسلمان فرقے ان دومہینوں میں جشن وسرور کی محفلیں جیسے شادی، اورخوشیوں کی مناسبت سے دوسری وہ محفلیں جہاں گانا بجانا ہو برپا نہیں کرتے۔

جاوہ کے جزیرہ میں یہ رسم ہے کہ محرم کے آتے ہی لوگ محرم سے مخصوص ایک کھانے کومہیا کرنے میں لگ جاتے ہیں جو عاشورا کے نام سے ماخوذ ہے اور اسے فقیر عزاداروں میں تقسیم کرتے ہیں جسے وہ لوگ بوبوسورا {bulan sura} کہتے ہیں سورا یہی عاشورا ہے جسے علاقائی زبان میں سورا کہا جاتا ہے۔

صوبہ آچاہہ کے شمالی حصہ میں ماہ محرم کو ماہ حسن وحسین علیہما السلام کہتے ہیں اورلوگ اس مہینہ میں نذر امام حسینؑ کے لئے کھانے کا اہتمام کرتے ہیں جس کو(کنج عاشورا) یعنی نذر عاشورا کہا جاتا ہے۔مغربی سوماترا کے بنکولو علاقہ میں ماہ محرم کے پہلے عشرہ میں تابوت کا جلوس نکالا جاتا ہے جو بعض دیگر شیعہ علاقوں میں تعزیہ اٹھانے سے کافی مشابہ ہے۔

شیعوں کی جانب سے مراسم عزا کے انعقاد میں نہ صرف عام لوگ بلکہ اہل سنت والجماعت کے بھی کچھ رہبر شرکت کرتے ہیں۔اس پروگرام میں شرکت کرنے اورجن شخصیتوں نے اس پروگرام میں شرکت کی اوراسے ایک رسمیت بخشنے کے ساتھ اس پر زور دیتے رہے ان میں انڈونیشا کی مجلس علماء{M.U.I} کے سابقہ صدر پروفیسر جناب الحاج گیاہی علی یافی اور انڈونیشا کی نہضت العلما کے جنرل سکریٹری جناب ڈاکٹر عقیل سراج کا نام لیا جاسکتا ہے۔

جناب عقیل سراج صاحب نے بارہا ان پروگراموں میں شرکت اورتقریر کی اورشیعوں کے ساتھ عزاداری میں حصہ لیا اس طرح کہ بہت سے لوگ انھیں شیعہ سمجھتے ہیں لیکن ان باتوں کا انڈونیشیا کے مسلمان لوگوں کے کلی زاویہ نظر پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔

ایران میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد وہابیت کی فکر آشکار اور مخفی طور پر بیرونی طاقتوں کی مدد کے ذریعہ مسلمانوں کے درمیان تفرقہ اور افراط و تعصب رائج کرنے کے لئے کوشاں ہوئی اور انڈونیشا میں مساجد کی تعمیرات وہابیت سے متعلقہ کتابوں کے چاپ ونشر کے ذریعہ شیعت کے خلاف سرگرم عمل ہوگئی لیکن مختلف فرقوں کی دوسروں کے ساتھ بھائی چارگی اور صلح آمیز طریقہ سے زندگی گزارنے اور لوگوں کے باہمی رواداری سے رہنے کی بنیاد پر انھیں کوئی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔

اور نہ صرف یہ کہ وہابی فکر اقلیت کے درمیان افراط اور تعصب کو رواج دینے میں ناکام رہی بلکہ اہل سنت کے علماء نے شیعوں کے خلاف حتی زبان کھولنے سے بھی پرہیز کیا۔

آخری بات انڈونیشا میں مختلف مغربی ممالک کے عیساؤں کے مختلف تبشیری گروہوں کی امدادرسانی کے کیمپوں کی صورت میں عیسائیت کی دوبارہ تبلیغ اور ترویج سے متعلق ہے۔

وہ مغربی ممالک جنھوں نے سونامی کے زلزلہ کی خبروں کے نشر ہونے کے آغاز تک کوئی مناسب اقدام اس سلسلہ میں نہیں کیا تھا اور کسی مناسب ردعمل کے عدم اظہار کی بنا پر دنیا کے لوگوں کے لئے خاص طور پر امدادرساں ایجنسیوں اور نامہ نگاروں کی جانب سے مورد اعتراض ٹھہرے تھے مجبور ہو کر انھیں اپنی امدادر کی تعداد میں اضافہ کرنا پڑا۔

اور اسی کے ساتھ مسیحت کی ترویج کا تبلیغی ٹولہ اپنی اس امدادرسانی سے ناجائز فایدہ اٹھاتے ہوئے میڈیا کے پروپیگنڈے سے استفادہ کرتے ہوئے لوگوں کے عقائد کی تبدیلی اور چوطرفہ اور وسیع پیمانہ پر عیسائیت کی تبلیغ میں سرگرم عمل ہوا ۔[۲۰] اور ایک بار پھر دنیا کے لوگوں کی طرف سے مورد اعتراض قرار پایا ۔

مصیبت زدہ اور پریشان حال مسلمان بھی جو اس طرح کی حرکتوں پر پہلے بھی چوکنے اور ہوشیار تھے انھوں نے پھر ہوشیاری کا ثبوت دیا اور اپنے عقائد پر جمے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بار پھر پوری دنیا نے مغرب

کے اس طرز عمل کی مذمت کی اور اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔

....

حواشی:

۱۔سید محمد الکاف، تعامل اہل اسنۃ مع قضیۃ عاشورا فی اندونیسیا، ص/۱، ومرتضی اسعدی، جہان اسلام، (تھران نشر دانشگاہی، ۱۳۶۶، جلد۱، ص ۲۸۷)

۲۔وزارت امور خارجہ، اندونیشیا، (تہران، دفتر مطالعات سیاسی وبین المللی) ص/۲۱۔

۳۔ برنادولک، تاریخ انڈونیشیا، ترجمہ ابوالفضل علی زادہ طباطبائی، (تہران، پژوہشگاہ، ۱۳۷۴) ص ۴۸

۴۔ وہی مدرک ص ۱۲۱

۵۔عبدالمجید ناصری داودی، وضعیت کنونی جہان اسلام (مرکز جہانی علوم اسلامی) ص ۲۱۴)

۶۔ برنارد ولک، وہی مدرک، ص ۱۲۶۔۱۲۵

۷۔انڈونیزی، ص ۳۳

۸۔ایراام لاپیدوس، تاریخ جوامع اسلامی قرون نوزدھم وبیستم، ترجمہ، دکتر محسن مدیر شانہ چی، ص/۲۵۸

۹۔دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، جلد۱۰، ص/۳۵۹.

۱۰۔ایم، بی ہوکر، اسلام درجنوب شرقی آسیا، ترجمہ محمد مہدی حیدر پور، ص/۲۰۵

۱۱۔ایرا، ایم لاپیدوس، وہی مدرک ص/۲۴۹

۱۲۔وہی مدرک ص/۲۸۵۔

۱۳۔ایم، جی ہوکر، اسلام درجنوب شرقی آسیا ص/۲۰۵

۱۴۔عبدالمجید ناصری داودی، وہی مدرک، ص/۲۱۸۔

۱۵۔ وہی مدرک

۱۶۔ ایم، بی ہوکر، وہی مدرک ص/۲۱۳

۱۷۔ غلام رضا گلی زوارہ، شناخت کشور ہای اسلامی (قم، دفتر تبلیغات اسلامی، ۱۳۷۲) ص/۱۵۴

۱۸۔ سید محمد الکاف، تعامل اہل السنہ مع قضیۃ عاشورا فی اندونیسیا ص/۲.

۱۹۔ وہی مدرک ص/۴

۲۰۔ ہفتہ نامہ پگاہ، ۸۳/۱۲/۷